# آشیانہ

04-13-2017

# فہرست

## صحت

ماحولیاتی آلودگی کا شکار بچے ..... ۱

## ادب و مزاح

انگلش ونگلش ..... ۲

## بچوں کی دنیا

انوکھی سزا ..... ۴
آخری گولی ..... ۵
بہادر لڑکا ..... ۷
تین دوست ..... ۸
شیر اور گیدڑ کا مقدمہ، بندر کا انصاف ..... ۱۰
میرا بکرا ..... ۱۱
ہائے میرا بچپن!!!! ..... ۱۲

## سچی کہانیاں

حکیم صاحب ..... ۱۴

## مشہور شخصیات

اردو ادب کاایک نام۔ ابن انشاء ..... ۱۶
اقبال اور فلسفہ خودی ..... ۱۷

## معاشرہ اور ثقافت

بہتر گھر ..... ۱۹
چینی کے بغیر چینی چائے کا لطف ..... ۲۰

# آشیانہ

لاہور ایک قدیم شہر ..... ۲۱
مدر ڈے ..... ۲۲

# ماحولیاتی آلودگی کا شکار بچے

مصنف: یوسف

عالمی ادارہ صحت کی تازہ ترین رپورٹ کے مطابق اس وقت دنیا بھر میں بچوں کا مستقبل ان کی صحت کے حوالے سے انتہائی خطرے سے دو چار ہے،اس کی وجہ ماحولیاتی آلودگی بتائی گئی ہے۔ اس آلودگی کی وجہ سے ایک اعشاریہ سات ملین بچے ہر سال دنیا بھر میں موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔

بچوں کی ہر چار اموات میں سے ایک یا اس سے زیادہ غیر صحتمندانہ ماحول کی وجہ سے ہوتی ہے۔ہر سال ماحولیاتی خطرات جن کا تعلق اندرون یا بیرون سے ہوتا ہے جن میں فضائی آلودگی،دھوئیں کی وجہ سے آلودگی،مضر صحت پانی،غیر مناسب سیوریج کا نظام یا سیوریج کے نظام کی عدم دستیابی اور حفظان صحت کے نظام کی خرابی کی وجہ ہر سال سے ایک اعشاریہ سات ملین بچے جن کی عمریں پانچ سال سے کم ہوتی ہے لقمہ اجل بن جاتے ہیں۔

عالمی ادارہ صحت کی دو مزید نئی رپورٹیں بھی منظر عام پہ آئیں جن میں ایک رپورٹ:Inheriting a Sustainable World: کے مطابق ایک ماہ سے پانچ سال کے بچوں کی موت کی وجہ ہیضہ،ملیریا اور نمونہ ہیں،جن کا تدارک ماحولیاتی خطرات کو کم کر کے کیا جا سکتا ہے۔جیسا کہ صاف پانی کا حصول،پکانے کے لئے صاف ایندھن کی دستیابی، عالمی ادارہ صحت کی ڈائرکٹر جنرل Dr Margaret Chan, کا کہنا ہے"آلودہ ماحول خاص طور پہ بچوں کے لئے مہلک ثابت ہوتا ہے۔ان کے بڑھتے ہوئے اعضاء، کمزور مدافعانہ نظام اور ان کی چھوٹے جسم اور ہوا کے راستے انہیں گندے پانی آلودہ ہوا سے غیر محفوظ بناتے ہیں،ان خطرات کا آغاز ماں کے پیٹ سے شروع ہوتا ہےاور قبل از وقت پیدائش کے خطرات کو بڑھاتا ہے۔مزید یہ کہ جب اندرون خانہ یا بیرون جب شیر خوار اور سکول جانے سے پہلے کی عمر کے بچے ہوائی آلودگی اور سگریٹ کے دھوائیں سے متاثر ہوتے ہیں تو ان میں نمونیہ کے خطرات بڑھ جاتے ہیں اور سانس کی متعدی بیماری جیسا کہ دمہ وغیرہ کا شکار ہونے کے خطرات بڑھ جاتے ہیں۔اس کے علاوہ ہوائی آلودگی میں رہنے کی وجہ سے دل کی بیماریوں، کینسر کا بھی خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ پانچ بڑی وجوہات جن کا تعلق بچوں کی اموات سے ہے ان کا تعلق ماحولیات سے ہے۔

ایک اور رپورٹ:A companion report, Don't pollute my future! The impact of the environment on children's health نے جامع جائزہ پیش کیا ہے جس کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں:

۵۷۰۰۰۰ پانچ لاکھ ستر ہزار بچے جن کی عمریں پانچ سال سے کم ہوتی ہیں ہر سال سانس کی بیماریوں کی وجہ سے ہلاک ہو جاتے ہیں جو کہ فضائی آلودگی اور سگریٹ کے دھوئیں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔

۳۶۱۰۰۰ تین لاکھ اکسٹھ ہزار بچے جن کی عمریں پانچ سال سے کم ہوتی ہیں صاف پانی تک عدم رسائی،سینی ٹیشن کے نظام کی خرابی اور حفظان صحت کے اصولوں پہ عمل نہ کرنے کی وجہ سے ہیضہ کا شکار ہوتے ہیں جس کی وجہ ہو کر موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔

۲۷۰۰۰ دو لاکھ ستر ہزار وہ بچے ہیں جو اپنی عمر کے ابتدائی مہینہ میں حفظان صحت کے فقدان، گندے پانی اور فضائی آلودگی کی بدولت اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ بیٹھتے ہیں۔

۲۰۰۰۰۰ دو لاکھ بچے جن کی عمریں پانچ سال سے کم ہوتی ہے ملیریا کا شکار ہو کر موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں ان کی زندگی کو بچایا جا سکتا ہے اگر ماحول کی صفائی کی جائے اور مچھروں کا تدارک کیا

جائے۔

۲۰۰۰۰۰ دولاکھ بچے جن کی عمریں پانچ سال سے کم ہوتی ہں وہ انجانے میں زخمی ہوتے ہیں مثلا زہر خورانی، گرنا اور پانی میں ڈوبنا وغیرہ۔

اوپر دیئے گئے اعداد وشمار اگرچہ کہ پوری دنیا سے لئے گئے لیکن اس تناظر میں آج ہم اپنے حالات کا جائزہ لے سکتے ہیں،کہ ہم ماحولیاتی آلودگی کے حوالے سے کس قدر احتیاط برت رہے ہیں، فضائی آلودگی کے حوالے سے عالمی روپورٹیں ہمارے ملک کے بڑے شہروں کے بارے جاری ہوتی رہتی ہیں کہ کس قدر آ؛ودگی بڑھ رہی ہے،ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق کراچی کی فضا میں اوزون کی تہہ کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے، اس کے علاوہ کراچی ہی کی میڈیا رپورٹس موجود ہیں کہ اکثریتی آبادی آلودہ پانی پینے پہ مجبور ہے۔یہ صورتحال پاکستان کے تمام بڑے اور چھوٹے شہروں کی ہے،بڑی بڑی آبادیاں گٹر وں سے آلودہ پانی پیتی ہیں،فضائی آلودگی کا حال یہ ہے کہ نہ ٹریفک کا نظام فعال ہے جو کہ دھواں چھوڑنے والی گاڑیوں کا تدارک کرے اور نہ ہی فیکٹریوں اور ملوں کے دھوئیں اور دیگر ویسٹ کو مناسب طریقے سے ٹھکانے لگانے کا کوئی عملی اور فعال نظام موجود ہے،اور مزید یہ کہ سب سے بری حالت سالڈ ویسٹ کے نظام کی ہے یا یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ ملک کے کسی بھی حصے میں قابل ستائش سالڈ ویسٹ سسٹم موجود نہیں ہے اس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ ہسپتال سانس،معدے،کینسر، گردے،دل کی بیماریوں کے مریضوں سے اٹے پڑے ہیں۔اور خاص طور پہ بچوں کی اموات ہو رہی ہیں۔

اس کے لئے ضروری ہے کہ حکومتی سطح پہ ہنگامی بنیادوں پہ کام ہونا چاہئے،خاص طور پہ بلدیاتی نظام کو فعال اور منظم کرنے کی ضرورت ہے اور اس نظام سے کرپٹ اور کالی بھیڑوں کو نکالنے کی ضرورت ہے تاکہ بہتر لوگ آگے آئیں اور ایک منظم سینی ٹیشن،پینے کے صاف پانی، سالڈ ویسٹ میجمنٹ، ٹائون پلاننگ کے ذریعے ماحولیاتی آلودگی سے ملک کو پاک کر نے میں کردار ادا کریں اور اس کے علاوہ ہر فرد معاشرہ پہ انفرادی سطح پہ بھی یہ اولین ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ بھی ماحول کو صاف کرنے میں اپنا کردار ادا کرے مثلا سگریٹ نوشی، سے اجتناب گلی و محلے میں کھلی جگہوں پہ کوڑا کرکٹ پھینکنے کی عادت کو ختم کرنا،، اپنے گلی اور گھر کی سیوریج کے نظام کو بہتر بنانا، کھلی نالیوں کو بند کرنا اور حفظان صحت کے اصولوں پہ نہ صرف خود عمل کرنا بلکہ خاص طور پہ بچوں کی تربیت کرنا۔اس حوالے سے خاص طور سکولوں اور کالجوں کی سطح پہ تربیت کا نصاب ترتیب دینا نیز پبلک کی آگاہی کے لئے مہمات اور اس سلسلے میں حکومتی اداروں کے شانہ بشانہ اپنا حصہ ڈالیں ،۔یقیناًاجتماعی کوششوں سے ہی اپنے بچوں کے مستبقل کو محفوظ بنایا جا سکتا ہے۔

§§§

# انگلش و نگلش

مصنف: یوسف

مجھے بچپن سے ہی انگریزی میں فیل ہونے کا شوق تھا لہذا میں نے ہر کلاس میں اپنے شوق کا خاص خیال رکھا۔ ویسے تو مجھے انگریزی کوئی خاص مشکل زبان نہیں لگتی تھی ، بس ذرا سپیلنگ ، گرائمراور Tenses نہیں آتے تھے۔ مجھے یاد ہے جو ٹیچر ہمیں کلاس میں انگریزی پڑھایا کرتے تھے وہ بھی کاٹھے انگریز ہی تھے، دو سال تک ''سی۔۔۔یو ۔۔۔پی۔۔۔''سپ'' پڑھاتے رہے، مشین کو ''مچین''اور نالج کو ''کنالج'' کہتے رہے۔ایسی تعلیم کے بعد میری انگریزی میں اور بھی نکھا ر آگیا، مجھے یاد ہے میٹرک کے داخلہ فارم میں جب ایک کالم میں ''Sex '' لکھا ہوا تھا تو میں کافی دیر تک شرماتے ہوئے سوچتا رہا کہ ایک لائن میں اتنی لمبی تفصیل کیسے لکھوں؟؟؟فارم کے پہلے کالم میں اپنا نام انگریزی میں لکھنا تھا لیکن انگریزی سے نابلد ہونے کی وجہ سے مجھے یہ نام لکھنے کے لیے اسلام آباد کا سفر کرنا پڑا کیونکہ فارم پر لکھا ہوا تھا''Fill in capital ''۔انگریزی فلمیں دیکھتے ہوئے بھی مجھے کہانی توسمجھ آجاتی تھی، سٹوری پلے نہیں پڑتی تھی۔سکس ملین ڈالر مین ، نائٹ رائڈر، چپس، ایئر وولف اور کوجیک جیسی مشہورِ زمانہ فلمیں میں نے صرف اور صرف اپنی ذہانت سے سمجھیں اور انجوائے کیں۔

آج سے کچھ سال پہلے تک مجھے یقین ہوچکا تھا کہ میں فارسی، عربی ، پشتو اور اشاروں کی زبان تو سیکھ سکتا ہوں لیکن انگریزی نہیں،لیکن اب جو حالات چل رہے ہیں اُن کو مدنظر رکھ کر میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ یا تو مجھے انگریزی آگئی ہے، یا سب کو بھول گئی ہے۔کچھ بھی ہو، میری خوشی کی انتہا نہیں، اب سارے سپیلنگ بدل گئے ہیں اور دو تین لفظوں میں سما گئے ہیں۔ اب Coming لکھنا ہو تو صرف cmg سے کام چل جاتا ہے۔گرل فرینڈ GF ہوگئی ہے اور فیس بک FB بن گئی ہے۔ اب کوئی انگریزی کا لمبا لفظ لکھنا ہو تو اُس سے پہلے کے چند الفاظ لکھ کر ہی ساری بات کہی جاسکتی ہے، میں نے ساڑھے تین سال کی''ٹیوشن بامشقت'' کے بعد unfortunately کے سپیلنگ یاد کیے تھے، آج کل صرف Unfort سے کام چل جاتاہے یعنی جہاں سے مشکل سپیلنگ شروع وہیں پہ ختم۔بات یہاں تک رہتی تو ٹھیک تھا لیکن اب تو

اس مختصر انگریزی میں بھی ایسی ایسی مشکلات آن پڑی ہیں کہ کئی دفعہ جملہ سمجھنے کے لیے استخارہ کرنا پڑتاہے۔ابھی کل مجھے ایک دوست کامیسج آیا، لکھا تھا''U r inv in bk crmy'' میں نے حیرت سے میسج کو پڑھا، اللہ جانتا ہے تین چار دفعہ مجھے شک گذرا کہ اُس نے مجھے کوئی گندی سی گالی لکھی ہے، دل مطمئن نہ ہوا تو ایسی ہی انگلش لکھنے اور سمجھنے کے ماہر ایک اور دوست سے رابطہ کیا، اُس مردِ مجاہد نے ایک سیکنڈ میں ٹرانسلیشن کردی کہ لکھا ہے You are invited in book's ceremony۔۔۔!!!

انگریزی سے نمٹنے کا ایک اوراچھا طریقہ میرے ہمسائے شاکر صاحب نے نکالا ہے، جہاں جہاں انہیں انگریزی نہیں آتی وہاں وہ اطمینان سے اُردو ڈال لیتے ہیں۔مثلاً اگر کھانا کھاتے ہوئے اُنہیں کسی کا میسج آجائے تو جواب میں لکھ بھیجتے ہیں''پلیز اِس ٹائم ناٹ ڈسٹرب، آئی ایم کھانا کھائینگ''۔ ایک دفعہ موصوف کو فیس بک پر ایک لڑکی پسند آگئی، فوراً لکھا''آئی وانٹ ٹو شادی وِد یو۔۔۔آر یو راضی؟''۔ لڑکی کا جواب آیا''ہاں آئی ایم راضی، بٹ پہلے ٹرائی ٹو راضی میرا پیو تے بے بے ''۔آج کل یہ دونوں میاں بیوی ہیں اوراکثر اسی انگریزی میں لڑائی جھگڑا کرتے ہیں، تاہم اب وہ درمیان میں اُردو کی بجائے پنجابی بولتے ہیں اور ایک جملہ بار باردہراتے ہیں'' آئی سیڈ کھصماں نوں کھا ، یور سارا خاندان اِز چول''۔

انگریزی کے بدلتے ہوئے رنگ صرف یہیں تک محدود نہیں، اب تو کوئی صحیح انگلش میں جملہ لکھ جائے تو اُس کی ذہنی حالت پر شک ہونے لگتا ہے، ماڈرن ہونے کے لیے انگریزی کا بیڑا غرق کرنا بہت ضروری ہوگیاہے ،میں تو کہتا ہوں انگریزی کی صرف ٹانگ ہی نہیں، دانت بھی توڑ دینے چاہئیں ، اِس بدبخت نے ساری زندگی ہمیں خون کے آنسو رُلایا ہے۔تازہ ترین اطلاعات کے مطابق اب انگریزی لکھنے کے لیے گرائمراورTenses بھی غیر ضروری ہوگئے ہیں۔یعنی اگر کسی کو کہنا ہو کہ ''میں تمہارا منتظر ہوں، تم کب تک آؤ گے؟'' تو بڑی آسانی سے اِسے چٹکیوں میں یوں لکھا جاسکتا ہے m wtg ?u cm whn۔۔۔!!!

دنیا مختصر سے مختصر ہوتی جارہی ہے، کمپیوٹر ڈیسک ٹاپ سے لیپ ٹاپ اور اب آئی پیڈ میں سما چکے ہیں، موٹے موٹے ٹی وی اب سمارٹ ایل سی ڈی کی شکل میں آگئے ہیں، ونڈو اے سی کی جگہ سپلٹ اے سی نے لے لی ہے،انٹرنیٹ ایک چھوٹی سی USB میں سمٹ چکا ہے

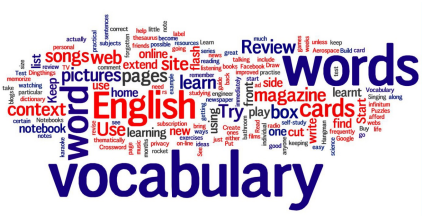
words
English
vocabulary
word
web
pictures
pages
site
learn
magazine
cards
box
context
notebook
Review
Try
Use
learning
new
home
extend
online
flash
side
one
cut
write
find
Keep
list
songs
play
learnt
Star
Vocabulary
Singing along
Infinitive
Puzzles
Quiz
Audio
Buy
go
Google
frequently
life
Build card
Aeroplane
unless
keep
great
series
Learn
Facebook
Drew
books
talking
actions
reading
Thesaurus
synonyms
Synonyms
Antonyms
Crossword
thesaurus
Thesaurus
Dictionary
Notebook
notes
certain
watching
particular
dictionary
Tips
Tricks
memorize
Tests
Dictionary
Meanings
review
Text
Vocabulary
Spelling
Grammar
Pronunciation
Translation
Quiz
Audio
Flashcards
Learning
Practice
Exercises
Tests
Quizzes
Games
Puzzles
Crossword
Anagrams
Hangman
Word Search
Word Scramble
Word Jumble
Word Ladder
Word Chain
Word Game
Word Puzzle
Word Quiz
Word Test
Word Exercise
Word Practice
Word Learning
Word Vocabulary
Word Dictionary
Word Thesaurus
Word Synonyms
Word Antonyms
Word Pronunciation
Word Translation
Word Audio
Word Flashcards
Word Tests
Word Quizzes
Word Games
Word Puzzles
Word Crossword
Word Anagrams
Word

''شارٹ ہینڈ'' کی وہ قسم ہے جو کسی کالج یا انسٹی ٹیوٹ میں نہیں پڑھائی جاتی۔اِس زبان میں خوبیاں تو بہت ہیں لیکن ایک کمی ہمیشہ محسوس ہوتی رہے گی، یہ جذبات سے عاری زبان ہے، یہ چند لفظوں میں دو ٹوک بات کرنے کی عادی ہے، اس زبان میں کسی کی موت پر v sad لکھ دینا ہی کافی سمجھا جاتاہے، یہ محبتوں اور احساسات سے محروم زبان ہے۔ میں یہ زبان کچھ کچھ سیکھ چکا ہوں، لیکن استعمال کرنے سے گھبراتا ہوں، پتا نہیں کیوں مجھے لگتاہے اگر میں نے بھی یہ زبان شروع کردی تومجھ میں اور روبوٹ میں کوئی فرق نہیں رہ جائے گا۔

§§§

# انوکھی سزا

مصنف: یوسف

''حسن بیٹا، دوکان سے ایک کلو چینی جلدی سے لے آؤ'' حسن کی امی نے حسن کو دیکھ کر بلند آواز سے کہا۔ حسن اس وقت کھیل کر گھر میں داخل ہورہا تھا۔

''جی امی! ابھی جاتا ہوں'' حسن نے جواب دیا، اور گھر سے کچھ ہی دور موجود دوکان کی طرف چل پڑا، دوکان پر پہنچ کر حسن نے ایک کلو چینی کا آرڈر دیا۔

دوکاندار حسن کی بات سن کر مڑا اور دوکان کے اندرونی حصے کی طرف چینی لینے کے لئے چلا گیا، اسی دوران حسن کی نگاہ دوکان میں سامنے ریکنگ پر رکھے ایک ڈبہ پر پڑی جو رنگ برنگے کیکوں سے بھرا پڑا تھا، حسن اس وقت بھوکا تھا، اسکے دل میں نہ جانے کیا خیال آیا اس نے دوکاندار کو اپنی طرف متوجہ نہ پاکر جلدی سے ایک کیک اٹھایا اور منہ میں ڈال کر نگلنے کی کوشش کرنے لگا، اسی دوران دوکاندار واپس آگیا، اور حسن کو چینی دی، حسن نے چینی لے کر رقم ادا کی، اور گھر کی طرف چل پڑا۔

حسن دل ہی دل میں بہت خوش تھاکہ دوکاندار اسکی چوری کو نہیں دیکھ سکا، اور کیک مفت میں اس نے کھا لیا، کیک کا ذائقہ حسن کو بہت اچھا لگا، لیکن اسے محسوس ہورہا تھا کہ جب سے اس نے کیک کھایا ہے اسکے گلے میں کوئی چیز پھنس سی گئی ہے۔

حسن گھر پہنچا، ماں کو چینی تھمائی اور ایک کمرے میں موجود آئینے کے سامنے جا کر کھڑا ہوگیا، حسن نے اپنا منہ کھولا اور آئینے کی مدد سے گلے میں جھانکنے لگا، کہ وہ کون سی چیز ہے جو اس کے گلے میں پھنس گئی ہے، اور اب تو درد بھی ہونے لگا تھا۔ حسن زور لگا کر پورا منہ کھولنے کی ناکام کوشش کرتارہا، مگر اسے کوئی چیز نظر نہیں آئی۔

ابھی حسن آئینے کے سامنے کھڑے منہ کھولے دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک حسن کی امی کمرے میں داخل ہوئیں اور حسن کو یوں منہ کھولے آئینے کے سامنے کھڑا دیکھ کر حیران ہوئیں، اور پوچھا، حسن بیٹا اس طرح منہ کھولے آئینے کے سامنے کھڑے کیا دیکھ رہے ہو۔

حسن اپنی امی کو سامنے دیکھ کر گھبر اگیا، اور بولا، نہیں امی، بس ویسے ہی کھڑا ہوں۔

ابھی حسن نے بس اتنا ہی کہا تھا کہ اس کے گلے میں ایسا شدید درد ہوا جیسے اسکے گلے کو کسی نے تیز دھار آلے سے کاٹ دیا ہو، حسن وہیں زمین پر لوٹ پوٹ ہوگیا۔

حسن کی امی یہ دیکھ کر گھبرا گئیں کہ اچانک میرے بیٹے کو کیا ہوگیا ہے ؟حسن کی امی نے جلدی سے حسن کو سیدھا کرکے بستر پر لٹایا اور پوچھا کہ کیا ہواہے بیٹا؟

حسن مسلسل چیخے، چلائے جا رہا تھا، اس کے گلے سے عجیب و غریب آوازیں نکل رہی تھیں، اسکے منہ سے ہلکا سا خون بھی باہر نکل رہا تھا۔ اب حسن کو یقین ہوگیا تھا کہ اسکے گلے میں کوئی چیز موجود ہے جسکی وجہ سے اسکی یہ حالت ہوگئی ہے۔ حسن کی امی یہ سب دیکھ کر سٹپٹا گئیں اور زور زور سے سب گھر والوں کو آوازیں دینے لگیں، حسن کے ابو،دادا، دادی، بہن، بھائی سب دوڑے چلے آئے، اور حسن کی حالت دیکھ کر سب گھبرا گئے۔

حسن کے دادا نے جلدی سے پانی منگوایا اور حسن کو بہت سا پانی پلایا لیکن کچھ افاقہ نہ ہوا۔ حسن کا درد اور ٹھیس ویسی ہی رہیں، اس کی حالت غیر ہو رہی تھی، وہ دل ہی دل میں اس وقت کو کوس رہا تھا، جب اس نے چوری چھپے وہ کیک کھایا تھا۔

حسن کی دادی اماں نے ایک روٹی کا ٹکرا منگوایا اور حسن کے منہ میں ڈال دیا، حسن نے اس روٹی کے ٹکڑے کو باہر اگل دیا، اس سے کچھ نہیں کھایا جا رہا تھا۔

تب حسن کے ابو نے سختی سے پوچھا کہ حسن سچ سچ بتاؤ کیا کھایا تھا جس کی وجہ سے یہ حالت ہورہی ہے ، حسن نے جب یہ دیکھا کہ اب بتانے کے سوا کوئی چارہ نہیں، تو اس نے روتے ہوئے شرمندہ لہجے میں سب کو بتادیا کہ اس نے دوکاندار کی نظروں سے بچ کر ایک کیک کھایا تھا تب سے اس کے گلے میں کوئی چیز پھنس گئی ہے۔

حسن کے ابو نے ایک خشک روٹی کا بڑا سا ٹکڑا منگوایا اور حسن کو اسکے نگلنے کا حکم دیا، حسن نے بہت انکار کیا، مگر اس کی ایک نہ چلی، مجبوراً اس نے وہ ٹکڑا منہ میں رکھا اور اسے نگلنے کی کوشش کرنے لگا، حسن کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا، وہ برے برے منہ بنا رہا تھا، اور دل میں اپنے آپ پر لعن طعن کررہا تھا کہ کاش وہ کیک کھانے کی غلطی نہ کرتا۔

حسن مسلسل اس خشک روٹی کے ٹکڑے کو نگلنے کی کوشش کررہاتھا، کہ اچانک اسے زوردار ابکائی آئی اور مسلسل قے شروع ہوگئیں، جیسے ہی قے رکی، حسن کو گلے میں کچھ سکون محسوس ہو، اسے محسوس ہورہا تھا کہ اب اسکے گلے میں کوئی چیز نہیں ہے، اب اسے درد بہت کم محسوس ہورہا تھا۔

حسن کے ابو اب اس قے کو دیکھ رہے تھے کہ آخر کیا چیز حسن کے گلے میں پھانس بن کر اسے تکلیف دے رہی تھی۔اچانک حسن کے ابو کو کسی کالی سی چیز کے ٹکڑے نظر آئے، غور سے دیکھنے پر پتا چلا کہ یہ چیونٹے کا پچھلا حصہ ہے اور یہی چیونٹا حسن کے گلے میں پھنس گیا تھا، اسی کے کاٹنے کی وجہ سے حسن کی حالت غیر ہوگئی تھی، چیونٹے دیکھ کر اب سب کو یہ بات سمجھ آگئی تھی کہ جب حسن نے جلدی سے کیک اٹھا کر منہ میں ڈالا تھا، تو اس وقت وہ چیونٹا اس کیک پر بیٹھا تھا، وہ بھی کیک کے ساتھ حسن کے منہ میں چلا گیا ، لیکن پیٹ میں جانے کی بجائے حلق میں پھنس کر رہ گیا، اور باہر نکلنے کی مسلسل کوشش کرنے کی وجہ سے حسن کو یہ سب کچھ جھیلنا پڑا۔حسن کو اس کے کیے کی سزا مل چکی تھی۔وہ سب گھر والوں کے سامنے نادم کھڑا تھا۔حسن کے ابو نے حسن کو گلے سے لگا لیا اور معاف کر دیا۔اور وعدہ لیا کہ آئندہ حسن کبھی ایسی حرکت نہیں کرے گا۔

اگلے دن جب حسن کی حالت کچھ سنبھل گئی تو حسن کی امی نے حسن کو پانچ روپے دیے اور کہا کہ جاؤ بیٹا یہ پیسے دکاندار کودے آؤ ۔یہ اس کیک کے پیسے ہیں جو تم نے کل کھایا تھا،حسن اسی دوکان پر چلا گیا اور دکاندار سے کہا کہ معذرت انکل،کل آپکی دوکان سے میں نے غلطی سے کیک کھایا تھا اور پھر حسن نے جیب سے پیسے نکالے اور دوکاندار کی طرف بڑھا دیئے ۔دوکاندار حسن کی اس ایمانداری کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور سامنے پڑے ہوئے اسی کل والے کیک کی طرح ایک اور کیک نکال کر حسن کی طرف بڑھا دیا اور کہا۔یہ کیک لے لو بیٹا،یہ میری طرف سے اس ایمانداری کا انعام سمجھ کر کھا لو،حسن نے جیسے ہی کیک دیکھااسے کل خود کے ساتھ بیتا ماجرا یاد آگیا،اسے یوں محسوس ہوا جیسے اسکے گلے میں پھر سے کوئی چیز پھنس گئی ہوحسن فورا گھر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔دوکاندار حسن کو یوں بھاگتا دیکھ کر حیران ہوا اور سوچنے لگا کہ کتنا پیارا اور نیک بچہ ہے،ایسا بچہ آجکل کہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔اب اسے کیا معلوم کہ حسن کے ساتھ یہ کیک کھانے کی وجہ سے کیا بیتی۔حسن نے گھر پہنچ کر اطمینان کا سانس لیا اور دل میں تہیہ کر لیا کہ آئندہ وہ کبھی چوری نہیں کرے گا اور نہ ہی کبھی کیک کھائے گا۔یوں حسن کی پہلی غلطی اس کی آخری غلطی بن گئی۔

§§§

# آخری گولی

مصنف: یوسف

وہ کل پانچ افراد تھے، تین مرد اور دو عورتیں۔ شام کے وقت ساحلِ سمندر کے ایک ویران گوشے میں، پتھروں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے دائیں طرف سمندر کی منہ زور لہریں ٹھاٹھیں مار رہی تھیں اور بائیں طرف ایک اونچی چٹان سر اٹھائے کھڑی تھی، جو کسی پہاڑی کا باقی ماندہ حصہ تھی۔ چند قدم دور چار پانچ گاڑیاں کھڑی تھیں اس گروپ کے چیف کا نام تھا شفقت اگرچہ شفقت نام کی کوئی چیز اس کے چہرے پر دکھائی نہ دیتی تھی۔ وہ ایک ہٹا کٹا شخص تھا، چٹان کی طرح مضبوط اور پتھر کی طرح پتھریلا۔ چیف نے اچانک پہلو بدلا اور بولا :

"خواتین و حضرات آپ سب ملک کی خفیہ تنظیم کے ارکان ہیں۔ آپ کی مناسب کارکردگی کو مدِنظر رکھ کر آپ کو ایک خفیہ مشن سونپا گیا۔ آپ میری ہدایات کے مطابق اپنا کام احسن طریقے سے سر انجام دیتے رہے مگر پھر ہم میں سے کسی نے ایک "کارنامہ" بھی سر انجام دے دیا، خفیہ سی ڈی کے چند منتخب حصے دشمن کے ہاتھوں فروخت کردیے گئے۔"

چیف پھر اچانک خاموش ہو گیا وہ گرم نظروں سے ایک ایک کا چہرہ پڑھ رہا تھا، ہر ایک کو بری طرح گھور رہا تھا، بات ہی ایسی تھی، ملک سے غداری اور تنظیم سے بے وفائی۔ چیف نے سرد ہوا سے بچاؤ کے لیے عمدہ اونی مفلر لے رکھا تھا۔ اس نے اپنا چرمی تھیلا کھول کراس میں سے ایک سیاہ بڑا پستول نکالا۔اس ماحول میں اس کی کرخت آواز پھر گونجی:

"غداری کی سزا موت ہوتی ہے، آپ سب جانتے ہیں کہ خفیہ ادارے غدار کو موت کے گھاٹ اتار کر دوسرے برے افراد کے لیے عبرت کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ کیا کسی کو اس بات پر اعتراض تو نہیں کہ غدار کومارا نہ جائے؟"

"نو چیف"چند ملی جلی آوازوں نے سر جھکا دیا۔

"گڈ تو گویا آپ سب اس تنظیم کے اچھے کارکن ہیں۔" چیف نے اپنی جیب میں سے تین گولیاں نکال کر پستول کو کھولا اور اس کے چیمبر میں وہ گولیاں ڈال دیں ۔ پھر پستول کی نال ہوا میں بلند کی اور ٹریگر دبا دیا۔چیف نے دو گولیاں فضا میں چلا کر ضائع کر دیں۔ اب آخری گولی باقی تھی۔

"غدار کی قسمت کا فیصلہ اب یہ آخری گولی کرے گی۔" چیف نے زبان کھولی تو سب کے چہروں پر ایک رنگ آ کر گزرگیا۔ غدار کی نامزدگی کے بغیر ہر ایک شخص اپنے آپ کو مجرم اور غدار سمجھ رہا تھا کہ کہیں غداری کا اس پرکوئی الزام تو نہیں لگ گیا۔

چیف نے پستول دوبارہ کھول کر اس کا چیمبر گھما دیا اور پھرا چانک پستول بند کر دیا۔ اس نے سب کو ترچھی نگاہ سے دیکھ کر کہا۔ "معزز خواتین و حضرات آپ سب شریف، ایمان دار اور پارسا افراد ہیں۔ آپ ملک کی اس خفیہ تنظیم کے ساتھ بھی مخلص ہیں۔ میں کسی بھی فرد پر غداری کا الزام لگا کر اس پر کیچڑ اچھالنا نہیں چاہتا۔ کیوں کہ یہ بات بہت بڑا "گناہ" ہے کہ کسی پر بہتان باندھا جائے، لہٰذا میں اس آخری گولی کا ہی فیصلہ تسلیم کروں گا دیکھئے، یہ گولی کیا فیصلہ کرتی ہے۔ میں اس عمل کا آغاز خود سے کرتا ہوں۔ میری آپ سب کے لیے دلی دعا ہے کہ آخری گولی صرف غدار کا ہی کام تمام کرے۔ مجھے اس طریقے پر بھروسا ہے۔ میں چند سال قبل بھی آخری گولی کی مدد سے غدار کو سزا دے چکا ہوں بلکہ قسمت غدار کو خود ہی ڈھونڈ لیتی ہے۔"

چیف نے پستول کی نالی اپنی کنپٹی پر رکھی، آنکھیں بند کیں اور پستول کی لبلبی دبا دی

"کلک۔"

اس نے آنکھیں کھول کر خدا کا شکر ادا کیا اور پستول شاد صاحب کے حوالے کیا۔ شاد صاحب نے گہرا سانس لیا اور پستول کی نالی اپنے سر پر رکھ کر پستول چلا دیا

" کلک۔"

شاد صاحب جی کر مراٹھے تھے۔ انہوں نے تھکی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ پستول عبدالقیوم صاحب کے حوالے کر دیا۔ عبدالقیوم صاحب چار بچوں کے باپ تھے انہوں نے زیرِ لب خدا سے دعا کی۔ ساری دنیا ان کے سامنے پل بھر میں سمٹ آئی۔ وہ غدار تو نہیں تھے مگر اس آخری گولی کا بھلا کیا بھروسا۔ انہوں نے خالقِ کائنات کو پکار کر پستول کی نالی اپنے ماتھے پر رکھی اور اس کی لبلبی دبا دی۔

" کلک۔"

وہ بچ گئے تھے۔ انہوں نے دل ہی دل میں شکرانے کے نفل ادا کرنے کا تہیہ کر لیا۔

پستول اب شمسہ کے ہاتھ میں تھا۔ شمسہ سخت گیر عورت دکھائی پڑتی تھی۔ عمر چالیس سال، تین بیٹوں کی ماں اور ایک بوڑھی بیمار ماں کی واحد خبر گیر۔ اس نے پستول تھام کر قدرے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا: "چیف میں غدار نہیں ہوں ، آپ میرا ریکارڈ چیک کر لیں اور کوئی ثبوت مل جائے تو مجھے الٹا لٹکا کر میری چمڑی اتار دیں، پھر مجھے بھوکے کتوں کے آگے ڈال دیں۔"

"نہیں، آپ تو بہت اچھی ہیں۔" چیف نے طنز کیا۔

"تو پھر؟"

"پھر فیصلہ آخری گولی کا ہو گا، جو اس پستول کے چیمبر میں گھوم رہی ہے۔"

"چیف میرے تین چھوٹے چھوٹے بیٹے ہیں جو رات کے کھانے پر میرا انتظار کر رہے ہوں گے اور میری بوڑھی ماں میرا حد درجہ شریف خاوند۔"

"اوہ آپ مجھے رلانے والی باتیں نہ کریں۔" چیف کی آواز بھی رندھ گئی۔ وہ اگرچہ اداکاری کر رہا تھا مگر کامیاب اداکاری کر رہا تھا۔

چیف کے بے لچک رویے اور بے لحاظ نظروں نے شمسہ کو بتا دیا کہ اس کا فیصلہ اٹل ہے۔ تب اس نے لرزتے ہاتھ سے پستول بلند لیا۔ پستول کی نالی اپنے سر پر رکھ لی اور کلمہ توحید کا ورد کرتے ہوئے لبلبی دبا دی۔

آواز صرف "کلک" کی ابھری

چیف نے اسے نئی زندگی کی مبارک باد دی، جو اس نے شکریہ کے ساتھ قبول کی۔

پستول اب مس کرن کے پاس تھا۔ کرن تیس سالہ لڑکی تھی۔ اس کے چہرے پر حد درجہ معصومیت کا غلبہ تھا۔ چیف نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ آخری گولی اس پستول میں جہاں کہیں بھی تھی، گھوم گھام کر پستول کے نالی کے عین سامنے یا بالکل قریب آچکی تھی۔ پستول چار بار چلایا جا چکا تھا اور اب خطرہ نوے فیصد سے بھی بڑھ چکا تھا، آر یا پار والا معاملہ تھا۔

"گولی چلائیں مس کرن" چیف نے اسے حکم دیا۔

تب پستول کرن کی گود میں پڑا تھا۔ اس نے شش و پنج میں مبتلا ہو کر پستول تھام لیا۔ اس نے ذرا ٹھہر کر کہا: "اندھی گولی کا فیصلہ اندھا ہوگا، میں نے کیا کیا ہے چیف کہ مجھے بھری جوانی میں موت کی گھاٹی میں دھکیلا جا رہا ہے۔"

چیف نے سخت لہجہ اختیار کیا: "اس پستول میں چھ گولیوں کی جگہ ہوتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ آخری گولی اب نالی کے سامنے پہنچ چکی ہو۔ معاملہ اگرچہ بہت خطرناک تھا مگر میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے بعد میں پستول کو اپنی کنپٹی پر رکھ کر چلاؤں گا اگر ایسا وقت یا تو"چیف نے ان سب کو دیکھ کر کہا۔ "میں خود کو سب سے پہلے سزاوار سمجھتا ہوں، اس لیے اس عمل کا آغاز میں نے خود سے کیا تھا اور انجام بھی وقت پڑنے پر خود ہی پر کروں گا مس کرن بے دھڑک گولی چلائیں اگر یہ غدارِ وطن نہ ہوئیں تو ان کی زندگی خواب نہیں ہو گی۔"

خوف زدہ کرن خاموش بیٹھی رہی۔

"مس کرن گولی چلائیں، اپنے چیف کا حکم ٹالنا بھی جرم ہے۔"

پھر کرن نے اچانک ہاتھ سیدھا کیا اور گولی چلا دی۔ فضا دھماکے سے گونج اٹھی تھی۔ چٹان پر بیٹھے ہوئے آبی پرندے اور سمندری بگلے اڑ گئے تھے۔ چیف چیخ کر پتھر پر سے نیچے گرا تھا اور اس نے اپنا سینہ اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔ وہ کراہتے ہوئے ریت پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا ۔ کرن ماہر نشانہ انداز تھی وہ کئی بار نشانہ اندازی کے مقابلوں میں انعام حاصل کر چکی تھی۔ اس نے اپنے فن کا مظاہرہ چیف کے عین دل پر کیا تھا۔ چیف کا حکم نہیں ٹالا تھا۔گولی تو چلائی تھی مگر اپنے سر پر نہیں، چیف کے سینے پر کرن نے وہ پستول پھینک

کر اپنے لباس میں سے ایک مائوزر نکال کر باقی ماندہ افراد پر تان لیا تھا تاکہ کوئی اسے روک نہ سکے۔ وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹ رہی تھی تاکہ چند قدم دور جا کر اپنی گاڑی میں سوار ہوسکے۔ اس نے گھوم کر اپنی گاڑی کی طرف دیکھا اور یہی لمحہ قیامت بن گیا اچانک اسے کسی نے فضا میں گیند کی طرح اچھال دیا۔ وہ منہ کے بل زمین پر گری تو مائوزر بھی اس کے ہاتھ سے نکل گیا ۔ اس کو شاد صاحب نے اپنے شکنجے میں قابو کر لیا۔ اس پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا کہ خاک میں غلطاں چیف پتھر پر پائوں دھرے کھڑا تھا اور اس کے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔چیف کے ہاتھ میں ایک چھوٹا پستول تھا جو اس نے یقینا اپنے اونی مفلر میں سے نکالا تھا وہ آخری گولی سے بچ نکلا تھا۔

چیف نے کہا: "مجھے تجھ پر پہلے ہی یقین کی حد تک شک تھا۔ میری خفیہ اطلاع کے مطابق تو نے ہیروں والے زیورات خریدے ہیں اور دنیا کے ایک مہنگے شہر میں بنگلہ بھی۔ کرن بی بی وہ آخری گولی، پٹاخا گولی تھی۔ میں اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ غدار تلاش کرنے کے لیے اندھی گولی کی مدد لیتا۔ میں نے جب چیمبر کو گھمایا تو بند کرتے وقت میں نے پستول کا چیمبر اپنے ہاتھ کے انگوٹھے کی مدد سے یوں روکا تھا کہ پٹاخا گولی پانچویں خانے میں تھی۔ میں نے تم لوگوں پر نفسیاتی حربہ استعمال کیا تھا اور یوں غدار لڑکی پکڑی گئی۔"

کرن جب تم مائوزر تھام کر قدم قدم، الٹے پائوں پیچھے ہٹ رہی تھی تو میری طرف تیرا دھیان نہیں تھا اور جب تم نے گاڑی کی طرف پلٹ کر مجھے ایک لمحہ دیا تو میں نے تجھے اٹھا کر فضا میں اچھال دیا، شاید تیرے علم میں نہ ہو کہ میں ایک ماہرِ نفسیات ہوں اور نجا ماسٹر بھی۔"

§§§

# بہادر لڑکا

مصنف: یوسف

بیان کیا جاتا ہے۔ ایک بادشاہ کسی مہلک بیماری میں مبتلا ہو گیا کافی دن علاج کرنے کے باوجود جب اسے آرام نہ آیا تو طبیبوں نے صلاح مشورہ کر کے کہا کہ اس بیماری کا علاج صرف انسان کے پتے سے کیا جاسکتا ہے اور وہ بھی ایسے انسان کے پتے سے جس میں یہ یہ خاص نشانیاں ہوں۔ یہ کہہ کر حکیموں نے وہ نشانیاں بتائیں اور بادشاہ نے حکم دے دیا کہ شاہی پیادے سارے ملک میں پھر کر تلاش کریں اور جس شخص میں یہ نشانیاں ہوں اسے لے آئیں۔ پیادوں نے فوراً تلاش شروع کر دی۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ وہ ساری نشانیاں ایک غریب کسان کے بیٹے میں مل گئیں۔ پیادوں نے کسان کو ساری بات بتائی کہ بادشاہ کے علاج کے لیے تیرے بیٹے کے پتے کی ضرورت ہے۔ اسے ہمارے ساتھ بھیج دے اور اس کے بدلے جتنا چاہے روپیہ لے لے کسان بہت غریب تھا۔ ڈھیر سارا روپیہ ملنے کی بات سن کر وہ اس بات پر آمادہ ہو گیا کہ سپاہی اس کے بیٹے کو لے جائیں۔ چنانچہ وہ اسے بادشاہ کے پاس لے آئے۔

خاص نشانیوں والا لڑکا مل گیا تو اب قاضی سے پوچھا گیا کہ اسے قتل کر کے اس کے جسم سے پتا نکالنا جائز ہو گا یا نہیں! قاضی صاحب نے فتویٰ دے دیا کہ بادشاہ کی جان بچانے کے لیے ایک جان کو قربان کر دینا جائز ہے۔

قاضی کے فتوے کے بعد لڑے کو جلّاد کے حوالے کر دیا گیا کہ وہ اسے قتل کر کے اس کا پتا نکال لے لڑکا بالکل بے بس تھا۔ وہ اپنے قتل کی تیاریاں دیکھ رہا تھا اور خاموش تھا۔ زبان سے کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔ لیکن جب جلاد تلوار لے کر اس کے سر پر کھڑا ہو گیا تو اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

بادشاہ خود اس جگہ موجود تھا۔ اس نے اسے مسکراتے ہوئے دیکھا تو بہت حیران ہوا۔ جلّاد کے ہاتھ میں ننگی تلوار دیکھ کر تو بڑے بڑے بہادر خوف سے کانپنے لگتے ہیں۔ اس نے جلّاد کو ر کنے کا اشارہ کر کے لڑکے کو اپنے پاس بلایا اور اس سے پوچھا لڑکے۔ یہ تو بتا، اس وقت مسکرانے کا کون سا موقع تھا؟

لڑکے نے فوراً جواب دیا، حضور والا دنیا میں انسان کا سب سے بڑا سہارا اس کے ماں باپ ہوتے ہیں۔ لیکن میں نے دیکھا کہ میرے ماں باپ نے روپے کے لالچ میں مجھے حضور کے سپرد کر دیا۔ ماں باپ کے بعد دوسرا سہارا انصاف کرنے والا قاضی اور بادشاہ ہوتا ہے۔ کہ اگر کوئی ظالم کسی کو ستائے تو وہ اسے روکیں۔ لیکن قاضی اور بادشاہ نے بھی میرے ساتھ انصاف نہ کیا اب میرا آخر ی سہارا خدا کی ذات تھی اور میں دیکھ رہا تھا کہ جلّاد ننگی تلوار لے کر میرے سر پر پہنچ گیا اور خدا کا انصاف بھی ظاہر نہیں ہو رہا۔ بس یہ بات سوچ کر مجھے ہنسی آ گئی۔

لڑکے کی یہ بات سنی تو بادشاہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے حکم دیا کہ لڑکے کو چھوڑ دو۔ ہم یہ بات پسند نہیں کرتے کہ ہماری جان بچانے کے لیے ایک بے گناہ کی جان لی جائے۔

کی جانیں پامال کرنے والے دنیاوی لحاظ سے بھی اتنے فائدے میں رہتے جس قدر نفع میں خلق خدا پر رحم کرنے والے رہتے ہیں۔

§§§

لڑکے کو اُسی وقت چھوڑ دیا گیا۔ بادشاہ نے بہت محبت سے اسے اپنی گود میں بٹھا کر پیار کیا۔ اور قیمتی تحفے دے کر رخصت کیا۔ کہتے ہیں۔ اسی وقت سے بادشاہ کی بیماری گھٹنی شروع ہو گئی اور چند دن میں ہی وہ بالکل تندرست ہو گیا۔

میں نے دیکھا بر لب دریائے نیل اک فیل باں اپنی دھن میں زیر لب کرتا تھا کچھ ایسا بیاں غور کر ہاتھی کے پیروں میں جو ہو گا تیرا حال ہو گی تیرے پاؤں میں بس یونہی مور ناتواں

وضاحت:اس حکایت میں حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے یہ نکتہ بیان کیا ہے۔ کہ جان خواہ بادشاہ کی ہو یا غریب کی، قدر و قیمت میں دونوں برابر ہیں۔ نیز یہ کہ خود غرض بن کر دوسروں

## آشیانہ

# تین دوست

مصنف: یوسف

چیں چوبلی اور توتو کتا مل کر کھیل رہے تھے۔ چیں چو نے توتو کو دھکا مارا۔ توتو گر پڑا۔ چیں چو تالی بجانے لگی۔ ’’ گرا دیا ، ... گرادیا ...‘‘

تو تو اٹھ گیا۔ اس پر تھوڑی مٹّی لگ گئی تھی ۔ اس نے مٹّی جھاڑی اور چیں چو سے بولا:’’ میں گراؤں تو کہنا مت کہ گرا دیا۔‘‘ ایسا دھکا ماروں گا کہ تم لڑھکتی چلی جاؤ گی۔‘‘

’’ تم گرا ہی نہیں سکتے۔‘‘ چیں چو ہنسنے لگی۔

’’اچھا۔‘‘.....’’ہاں!‘‘

’’ تو تیار ہوجاؤ۔‘‘.....چیں چو پنجے گڑا کر کھڑی ہوگئی ۔

توتو جانتا تھا کہ چیں چو پنجے گڑا کر کھڑی ہوجائے گی اور وہ اسے گرانہیں پائے گا۔ پھر بھی وہ اس کے پاس آیا اور دھکا مارا ۔ چیں چو ذرا سی ڈگمگا کر رہ گئی۔

تم میں توبہت طاقت ہے ۔ میں سچ مچ تم کو نہیں گرا پایا۔‘‘ توتو بولا۔

’’میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا ۔‘‘ اتنا کہہ کر چیں چو آرام سے کھڑی ہوگئی۔ توتو ہوشیاری سے یہ سب دیکھ رہا تھا ۔ وہ ذرا سا پیچھے ہٹا اور تیزی سے آکر ایک دھکا مارا۔ چیں چو زور سے لڑھک کر زمین پر گر گئی۔ اب تالی بجانے کی باری توتوکی تھی وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

چیں چو اور تو تو دونوں بہت کھلنڈرے تھے وہ دونوں اس وقت مذاق ہی تو کررہے تھے۔ چیں چو کھڑی ہوگئی ۔ اس نے بھی اپنے جسم پر لگی دھول مٹّی جھاڑی اور بولی :’’ ایسادھکا دینے سے کیا ہوتا ہے ؟ ذرا پہلے ہی بول کر دیتے تو سمجھ میں آتا مجھے نہیں گرا سکتے تھے۔‘‘

توتو کچھ نہیں بولا اور ہنستا رہا ۔

اس کے بعد توتو کہیں سے گیند اٹھا لایا ۔ دونوں کچھ دیر گیند سے کھیلتے رہے۔

شام ہورہی تھی ۔ توتو بولا:’’ چیں چو! اب میں گھر جاؤں گا۔ آج تو کھیلتے کھیلتے تھک گیا ہوں ۔ ماں انتظار کررہی ہوگی ۔ آج وہ کچھ دیر بعد مجھے کہیں گھمانے لے جائیں گی۔‘‘

’’ تو جلدی جاؤ!‘‘ چیں چو بولی ۔ ’ میں بھی تھک گئی ہوں ۔لیکن کل مجھے ضرور بتانا کہ تم کہاں گھومنے گئے تھے۔ ‘‘ وہ پھر بولی۔ ’’ کل میری ماں مجھے کچھ نئی چیز کھانے کو دینے والی ہیں مگر مجھے بتایا نہیں ہے۔ دیکھیں کیا دیتی ہیں؟ ‘‘

تو تو اپنے گھر چل دیا اور چیں چو اپنے گھر۔ دونوں کو الگ الگ سمت جانا تھا۔

جب چیں چو اپنے گھر جارہی تھی۔ راستے میں پھدکو بندر ملا ۔ وہ درخت کی ایک شاخ پر بیٹھا تھا۔ چیں چوکو دیکھتے ہی شاخ پر سے بولا:’’ کھو کھو... کھوکھو۔‘‘

چیں چوں سمجھ گئی کہ یہ پھدکو بندر ہے۔

’’ ارے بھئی! کیا حال ہے؟ نیچے تو آؤ۔ ‘‘ چیں چو بولی۔ ’’ کچھ کہنا ہے کیا؟‘‘

’’ کہنا تو ہے لیکن نہیں کہوں گا۔ آج کل تو تم توتو کے ساتھ زیادہ کھیلتی ہو۔ میں تو درخت کی شاخ پر اکیلا بیٹھا رہتا ہوں ،تم کو تو میرا خیال ہی نہیں رہتا۔‘‘ پھدکو نے شکایت کی ۔

’’ تو تم بھی کھیلا کرو ہمارے ساتھ ، بڑے برگد کے پاس آجایا کرو ۔ وہیں توتو آتا ہے ہم تینوں مل جُل کر کھیلا کریں گے۔ ‘‘ چیں چو نے دوستا نہ انداز میں کہا۔

’’ہاہا... ہاہا... ہاہا ‘‘ پھدکو زور سے ہنسا اور کہنے لگا: ’’ میں تو ۔ توتو کے ساتھ نہیں کھیلوں گا ۔ نہ جانے کب وہ مجھے کاٹ لے ؟ جب وہ بھونکتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے بادل گرج رہا ہو۔ مجھے تو اُس سے بہت ڈر لگتا ہے ۔‘‘

’’ تم بے کار میں توتو سے ڈر رہے ہو۔‘‘ چیں چو بولی۔

’’ میں بے کار میں نہیں ڈررہا ہوں ۔ بل کہ صحیح معنوں میں ڈررہاہوں ۔‘‘ پھدکو نے کہا۔اور پھر سرگوشی کے انداز میں چیں چو کو بولنے لگا کہ :’’ میں تو کہوں گا کہ اب تم بھی اُس کے ساتھ کھیلنا چھوڑ دو ۔ نہیں تو وہ کسی دن تمہیں بھی ضرور دھوکا دے گا ۔ اور تمہارے دونوں کان کاٹ کر کھاجائے گا یا تمہاری دم چبا جائے گا۔ وہ بہت دھوکے باز ہے ۔ ‘‘

’’ یہ سب سراسر غلط ہے ۔‘‘ چیں چو بولی۔

’’ غلط بات نہیں ہے۔ ‘‘ پھدکو نے بات کاٹی اور آگے بولا:’’ کیا بلی اور کتے کی کبھی دوستی رہ سکتی ہے ۔ بلی کتے کو دیکھ کر ہمیشہ ڈرتی رہی ہے ۔ کوئی وجہ ہوگی تب ہی تو بلی کتے سے ڈرتی ہے ۔ میں نے تمہاری بھلائی کے لیے یہ نصیحت کی ہے اب تمہاری مرضی تمہیں اس کے ساتھ کھیلنا ہے کھیلو یا مت کھیلو۔ لیکن یاد رکھنا وہ ضرور کسی دن تمہیں دھوکا دے گا ۔‘‘ پھدکو نے پھر سے یہ بات دہرائی کہ :’’وہ تمہارے دونوں کان کاٹ کر کھاجائے گا یا تمہاری دم چبا جائے گا۔ وہ بہت دھوکے باز ہے ۔ ‘‘

’’ یہ بات تو ٹھیک ہے کہ بلی اور کتے کی کبھی نہیں نبھتی لیکن یہ سب کے ساتھ ٹھیک نہیں ہے ، ہم دونوں ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست ہیں ۔‘‘ چیں چو نے پھدکو سے کہا۔

’’اچھا! دوسری مثال بھی سنو۔‘‘ پھدکو بولا:’’ شیر اور ہرن میں کبھی دوستی نہیں سنی گئی ۔ جب بھی شیر ہرن کو دیکھتا ہے ، وہ اس کو مارنے دوڑتا ہے ۔ اگر پکڑ لیتا ہے تو وہ ہرن کو مار ہی ڈالتا ہے ۔ اس لیے شیر ہرن کو دیکھ کر بھاگتی ہے۔ اسی طرح بلی اور کتے کا معاملہ ہے۔‘‘

’’ میں تمہاری اس بات سے اختلاف نہیں کرتی ۔‘‘ چیں چو نے کہا۔اور بولی :’’ بل کہ میں ایک مثال اور دیتی ہوں ، وہ بھی کسی دوسرے کی نہیں خود اپنی یعنی بلی اور چوہے کی ۔ بلی چوہے کی دشمن ہے ، وہ جہاں کہیں چوہے کو دیکھتی ہے اس کو مارڈالتی ہے ۔ لیکن کہیں بلی اور چوہے کی دوستی ہوئی ہے؟ میری اور توتو کی دوستی کی بات الگ ہے۔‘‘

'' میں نے جو سمجھا وہ تمہیں بتادیا۔'' پھدکو بولا۔'' تم میری اچھی دوست ہو ۔اس لیے تم کو بتادیا ، نصیحت کردی ، اب تمہاری مرضی تم میری بات مانو یا نہ مانو ، لیکن یاد رکھنا وہ ضرور کسی دن تمہیں دھوکا دے گا ۔'' پھدکو نے پر سے یہ بات دہرائی کہ :''وہ تمہارے دونوں کان کاٹ کر کھاجائے گایا تمہادی دم چبا جائے گا۔ وہ بہت دھوکے باز ہے ۔ ''

چیں چو کو پھدکو کی یہ باتیں اچھی نہیں لگیں۔ یہ تو کسی کی برائی بیان کرنا ہوا ، غیبت کرنا ہوا ۔ برائی اور غیبت تو دشمن کی بھی نہیں کرنی چاہیے ۔ غیبت کرنا یا کسی کی دوستی کو توڑنا یا کسی میں جھگڑا لگوادینا اچھی بات نہیں ہے بل کہ یہ تو سب سے بڑا دھوکا ہے ۔ اُس نے یہ باتیں پھدکو سے نہ کہی بل کہ من ہی من میں سوچتے ہوئے چپ چاپ اپنے گھر کی طرف بڑھ گئی۔

چیں چو اور توتو ہمیشہ کی طرح کھیلتے رہے ، ہنستے بولتے ، گاتے رہے ۔ چیں چو روز پھدکو کو کھیلنے کے لیے بلاتی رہی لیکن وہ باربار بلانے کے باوجود بھی کبھی ان کے ساتھ کھیلنے کے لیے نہیں آیا۔ وہ یہی کہتا رہا کہ توتو اُسے کاٹ لے گا ، وہ مجھے پسند نہیں ہے ۔ بل کہ وہ چیں چو سے اکثر کہتا کہ :'' وہ کسی دن تمہیں دھوکا دے سکتا ہے وہ تمہارے دونوں کان کاٹ کر کھاجائے گایا تمہادی دم چبا جائے گا۔ وہ بہت دھوکے باز ہے ۔ ''

وقت گذرتا رہا کہ ایک دن جھاڑی کے قریب سے چند لڑکے جارہے تھے ۔ ان کے ہاتھوں میں غلیلیں تھیں ، وہ صورت شکل سے ہی بڑے شرارتی لگ رہے تھے۔ چیں چو اور توتو جہاں کھیل رہے تھے وہ لڑکے وہیں سے گذرے تھے۔ اُن میں سے ایک نے کہا:'' میرا نشانہ ایسا پکا ہے کہ جس کو غلیل ماروں وہ بچ ہی نہیں سکتا ۔ میں اڑتے ہوئے پرندے کا بھی نشانہ لگا سکتا ہوں۔''

'' تو چلیں بندر کو غلیل ماریں۔'' ایک لڑکے نے کہا۔'' وہ دیکھو ! بندر شاخ پر بیٹھا ہے۔''

'' ہاں دیکھیں! کس کا نشانہ صحیح بیٹھتا ہے؟'' ایک دوسرے لڑکے نے کہا۔

اُن لڑکوں کی باتیں چیں چو نے بھی سنا اور توتو نے بھی ۔ توتو بولا:'' چیں چو! تم یہیں رہو۔ میں اِن لڑکوں کے ساتھ ساتھ جاتا ہوں۔ یہ جیسے ہی غلیل چلانے جائیں گے۔ میں اتنی زور سے بھونکوں گا کہ یہ ڈر کر بھاگ جائیں گے۔ اپنی بھوں بھوں سے میں انھیں ایسا ڈراؤں گا کہ پھر کبھی بھی وہ ادھر آنے کی ہمت نہیں کریں گے۔''

'' ٹھیک ہے، لیکن میں بھی آتی ہوں ۔ تم جا کر اُن لڑکوں کو ڈراؤ۔'' چیں چو نے کہا۔

لڑکے جلدی سے درخت کے پاس پہنچے ۔ ایک لڑکے نے کہا :''دیکھومیرا نشانہ کتنا صحیح ہے میں غلیل چلاؤں گا تو میرا ڈھیلا سیدھا بندر کے سر پر لگے گا۔ ''

توتو کے قریب آکر چیں چو بھی کھڑی ہوگئی۔ پھدکو بندر درخت پر سے دیکھ رہا تھا کہ ایک لڑکا اس کو غلیل مارنے والاہے۔ اُس نے سوچ لیا کہ جیسے ہی وہ لڑکا غلیل چلائے گاوہ چھلانگ لگاکر دوسری شاخ پر چلا جائے گا۔

لڑکے نے جیسے ہی غلیل سے نشانہ لگایا ۔ توتو نے ایسی زور سے بھوں بھوں بھونکا کہ وہ بُری طرح ڈر گئے اور غلیل وہیں پھینک کر نو دو گیارہ ہوگئے۔ پھدکو نے دیکھا کہ لڑکے ڈر کر وہاں سے بھاگ گئے اور اس نے یہ بھی دیکھا کہ ان کو توتو نے ڈراکر بھگایا ہے۔

اب پھدکو بڑا شرمندہ ہوا۔ کہیں ڈھیلا اسے لگ جاتا تو؟ توتو نے شرارتی لڑکوں کو بھگا کر اُس پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔

پھدکو شاخ سے کود کر نیچے آیا اور توتو سے بولا:'' بھیا! مجھے معاف کردینا ۔''

''کس بات کے لیے ؟'' توتو نے انجان بن کر پوچھا ۔ '' کیا چیں چو دیدی نے تمہیں کچھ نہیں بتایا؟'' پھدکو نے کہا۔

'' نہیں مجھے تو کچھ نہیں معلوم ۔'' توتو بولااور چیں چو سے پوچھا:'' کیا بات ہے چیں چو؟''

'' کچھ نہیں کوئی بات نہیں ہے ۔'' چیں چو بولی۔ وہ توتو کو کچھ بتانا نہیں چاہتی تھی کہ کہیں پھدکو اور توتو میں دراڑ پڑ جائے۔

اب پھدکو خود ہی بولا :'' میں نے ایک دن چیں چو سے کہا تھا کہ توتو تمہیں کسی دن دھوکا دے گا ، اُس کا ساتھ چھوڑ دو۔''

توتو ہنسا :'' بس اتنی سی بات ، اس کے لیے معافی مت مانگو ۔ تمہارے دل میں شک تھاسو وہ آج دور ہوگیا۔ ہم تینوں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔

توتوکتے نے پھدکو بندر کا ہاتھ پکڑ لیا ۔ پھدکو بندر کا ہاتھ چیں چو بلی نے پکڑ لیا اور تینوں کہتے جارہے تھے ہم تینوں دوست ہیں۔

§§§

# شیر اور گیدڑ کا مقدمہ، بندر کا انصاف

مصنف: یوسف

بہت عرصے قبل ایک شیر اور گیدڑ میں گہری دوستی تھی اور وہ دونو ں ایک دوسرے کو حیران کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ ایک دن شیر نے ایک مو ٹی تا زی بکری کو زندہ پکڑا اور اپنے دوست گیدڑ پر رعب جھا ڑنے کے لیے جلدی جلدی اس کی بھٹ پر آیا لیکن جب وہ وہا ں پہنچا تو حیرت سے اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں کیونکہ گیدڑ اس سے پہلے ہی ایک گائے کو پکڑے بیٹھا تھا۔ ''ایک گیدڑ شیر سے اچھا شکا ر کیسے کر سکتا تھا؟ '' شیر نے غصے میں سوچا اور خاموشی سے بکری کو باہر گائے کے ساتھ باندھ کر سونے کے لیے چلا گیا کیونکہ را ت کا فی ہوچکی تھی لیکن وہ ساری رات جاگتا رہا کیونکہ اسے حسد ہو رہا تھا کہ آخر گیدڑ نے گائے کو پکڑا کیسے۔ آخرکار اس سے رہا نہیں گیا تو سورج نکلنے سے پہلے ہی با ہر نکل کر گائے کے پاس پہنچ گیا لیکن وہا ں گائے کے ساتھ ایک بچھڑا بھی کھڑا تھا جسے را ت میں ہی گائے نے جنم دیا تھا۔ بچھڑے کو دیکھتے ہی شیر کے ذہن میں ایک خیا ل آیا اور اس نے خود سے کہا ''میرے دوست کو دونو ں کی ضرورت نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر وہ بچھڑے کو بکری کے پا س لے گیا اور اسے اس کا دودھ پلا نا شروع کر دیا اور صبح ہوتے ہی وہ چلا تا ہوا گیدڑ کے پاس گیا اور اس سے کہا '' جلدی چلو میرے ساتھ.... میری بکری نے رات میں بچھڑے کو جنم دیا ہے۔'' گیڈر نے جب جا کر دیکھا تو بچھڑا بکری کا دودھ پی رہا تھا۔ یہ دیکھ کر اس نے نفی میں سر ہلا تے ہوئے کہا : ''ناممکن '' ایک بکری کے یہا ں گائے کا بچہ نہیں ہو سکتا۔ صرف گائے ہی بچھڑے کو پیدا کر سکتی ہے۔ یہ بچھڑا میرا ہے۔ ''

یہ بات سن کر شیر نے غرا تے ہوئے کہا پا گل مت بنو۔ ثبوت تمہا رے سامنے ہے۔ یہ دونو ں ایک ساتھ کھڑے ہیں اور یہ بچھڑا میرا ہے۔'' ''نہیں میں اس ثبو ت کو نہیں مانتا۔'' گیدڑ نے غصے سے جوا ب دیا اور پھر دونوں آپس میں لڑنے لگ گئے۔ اچانک شیر نے کہا '' ہم دونوں کسی کو منصف بنا کر اس بات کا فیصلہ کروالیتے ہیں کہ یہ بچھڑا کس کا ہے؟ ٹھیک ہے لیکن میں تین لو گو ں سے فیصلہ لوں گا۔ گیدڑ نے جوا ب دیا۔ شیر اس پر را ضی ہوگیا اور وہ دونوں تین عقل مند جانوروں کو تلاش کرنے لگے جو ان کا فیصلہ کر سکیں۔ چلتے چلتے وہ ہرنو ں کے ریوڑ کے پا س پہنچے جو درخت کے پتے کھا رہے تھے۔ کیا تمہا رے ریوڑ میں کوئی عقل مند ہے؟'' شیر نے ان کے قریب جا کر کہا۔ اس کی بات سن کر ایک بوڑھی ہرنی آگے بڑھی اور کہا اپنے ریوڑ کے جھگڑوں کا فیصلہ میں کرتی ہوں ، بولو کیا کام ہے ؟ ہم ایک مسئلے کو حل کرانا چاہتے ہیں'' یہ کہہ کر دونوں نے کہا نی سنانی شروع کر دی۔ اب ان کی کہانی سن کر ہرنی سوچ میں پڑ گئی کیونکہ وہ اچھی طر ح جا نتی تھی کہ بکری بچھڑے کو پیدا نہیں کر سکتی لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ شیر بہت خطرنا ک جانور ہے۔ اسی لیے اس نے شیر کی طر ف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ بات سچ ہے کہ ہما ری جوانی میں بکری بچھڑے کو جنم نہیں دے سکتی تھی اور یہ کام صر ف گائے ہی کرسکتی تھی تا ہم اب زمانہ بدل گیا ہے اور بکری بچھڑے کو جنم دے سکتی ہے اور میرا فیصلہ یہی ہے کہ یہ بچھڑا شیر کا ہے۔ ''

''کیا ....یہ نہیں ہو سکتا '' ہرنی کا فیصلہ سن کر گیدڑ نے غصے سے کہا۔ ''چلو اب دوسرے منصف کو ڈھونڈتے ہیں۔'' یہ کہہ کر دونوں نے دوسرے جانور کو ڈھونڈنا شروع کر دیا جوان کو انصاف دلا سکے۔ چلتے چلتے وہ چٹانو ں کی طرف پہنچ گئے ، جہاں انہیں ایک لگڑ بگڑ نظر آیا اور انہو ں نے اسے سا را ما جرا سنا دیا۔ ان کی بات سن کر لگڑ بگڑ نے شیر کی طرف دیکھا۔ اسے یا د تھا کہ شیر اس کے بہت سارے دوستوں کو کھا چکا ہے ، اس لیے اس نے اپنا گلا صاف کرتے ہوئے کہا: '' سنو معمولی بکری ہی بکری کے بچے پیدا کر سکتی ہے لیکن غیر معمولی نسل کی بکری سب کچھ کر سکتی ہے اور یقینا شیر کی بکری بہت غیر معمولی ہے اور اسی وجہ سے یہ بچھڑا بھی شیر ہی کا ہے۔ ''

'' تم پا گل ہو گئے ہو کیا ؟ '' گیدڑ نے غرا تے ہوئے لگڑ بگڑ کو جوا ب دیا اور شیر سے کہا '' چلو اب ہمیں تیسرے انصاف کیلئے منصف کو تلا ش کر نا ہے۔''چلتے چلتے وہ ایک چٹان کے قریب پہنچے جہا ں ایک بوڑھا بندر لیٹا ہواتھا۔

گھر جا کر اپنے بچھڑے کو کھانا چاہتا ہوں '' صبر کرو ابھی میں بہت مصرو ف ہو ں '' بندر نے جوا ب دیتے ہوئے کہا اور پتھر اٹھا لیا۔ '' مصروف ؟'' شیر نے غرا تے ہوئے پو چھا ''کیا کر رہے ہو ؟'' '' ساز بجا رہا ہو ں میں ہمیشہ فیصلہ کرنے سے قبل تھوڑا سا سا ز بجا تا ہو ں '' '' کیا ؟'' شیر نے چلاتے ہوئے کہا '' تم ہمیں بیوقوف بنا رہے ہو ، تمہا رے ہا تھ میں پتھر ہے اور سب جانتے ہیں کہ پتھر سے موسیقی کی آواز نہیں نکل سکتی۔''

یہ بات سن کر بند ر نے پتھر کو ایک طر ف رکھا اور کہا '' اگر ایک بکری بچھڑے کو پیدا کر سکتی ہے تو پھر پتھر سے بھی مو سیقی کی آواز آسکتی ہے اور تم نے سنا ؟ کتنی سریلی موسیقی ہے '' یہ سن کرشیر ساری بات کو سمجھ گیا اور اس نے غرا تے ہو ئے کہا ''ہاں یہ آواز تو بہت خوبصورت ہے ''۔اس کی بات سن کر ارد گرد جمع ہو نے والے سارے جانور بند ر کی عقل مندی اور جرات کے قائل ہو گئے اور انہو ں نے چلا تے ہوئے کہا ''بندر اس جھگڑے کا فیصلہ کر چکا ہے کہ صرف گائے ہی بچھڑے کو جنم دے سکتی ہے اور اس پر گیدڑ کا حق ہے۔''

اب تمام جانوروں نے شیر کو لعن طعن شروع کر دی کہ وہ اپنے دوست کو دھو کا دے رہا تھا۔ یہ ما جرا دیکھ کر شیر نے شرم سے سر جھکا لیا اور واپس جا کر گیدڑ کوگائے کا بچہ واپس کر دیا۔

§§§

" معاف کیجئے گا " شیر نے بند ر کا کندھا ہلا تے ہوئے کہا "کیا آپ ہما رے جھگڑے کا منصفانہ فیصلہ کر سکتے ہیں؟" یہ با ت سن کر بندر نے با ری با ری دونو ں کی بات سنی۔ ان کی بات ختم ہو نے کے بعد بند ر نے چٹان پر ادھر ادھر کچھ دیکھنا شروع کردیا جیسے کچھ تلا ش کر رہا ہو۔ " کیا تم کھانے کے لیے کچھ ڈھونڈ رہے ہو ؟"شیر نے دھاڑتے ہوئے کہا " ہمیں جلدی فیصلہ سنا؟ مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے اور میں

# میرا بکرا

مصنف: یوسف

بقر عید کی آمد آمد تھی اور ہر جگہ قربانی کے جانوروں کی منڈیاں سج گئ تھیں۔ جب سے برابر والے مرزا صاحب اپنا بکرا لے آ تھے ہم نے تو ابا جان کی جان کھالی تھی کہ بس اب بہت دیر ہوگئی چلیں بکرا منڈی ۔۔۔سب لوگ جانور لے آ ہیں ۔ میں اپنی پسند کا بکرا لونگا ۔وغیرہ وغیرہ۔ ابا جان کب سے ٹال رہے تھے مگر آج ہمارے آنسوؤں نے انہیں بھی موم کردیا اچھا چلو تم بہت ضدی ہو گ ہو۔ چاچا کے ساتھ چلتے وہ ایک دو دن میں جائیں گے مگر میری رٹ کے آگے مجبور ہوگ ۔اور ان کی ہاں سنتے ہی ہم لگے منڈی جانے کی تیاری کرنے ۔ برابر والے مرزا صاحب سے مول تول کی بابت دریافت کیا تو ہوش ہی اڑ گ مگر چہرے سے بلکل ظاہر نہیں ہونے دیا کہ پیسے بجٹ سے باہر ہیں ۔خیر ابا جان کی موٹر سائیکل پر بیٹھے اور ہوا کی طرح منزل یعنی منڈی کی طرف روانہ ہو ۔ واہ منڈی کیا تھی قربانی کے جانوروں کا ایک سمندر تھا تا حد نگاہ تک ۔ ہم نے ایک سمت سے اپنا گوہر نایاب ڈھونڈنا شروع کیا ۔ ابا جان ہر بکرے کی شان میں قصیدے پڑھ رہے تھے مگر ہمیں جس ہیرے کی تلاش تھی وہ نظر نہیں آرہا تھا ۔ خیر ہم نے بھی ہمت نہیں ہاری ایک جگہ وہ ہمیں نظر آ ہی گیا۔ سفید رنگت ،لمبے گھومے ہو سینگ ،سرگیں آنکھیں ،،چہرے پر بلا کی نخوت ۔

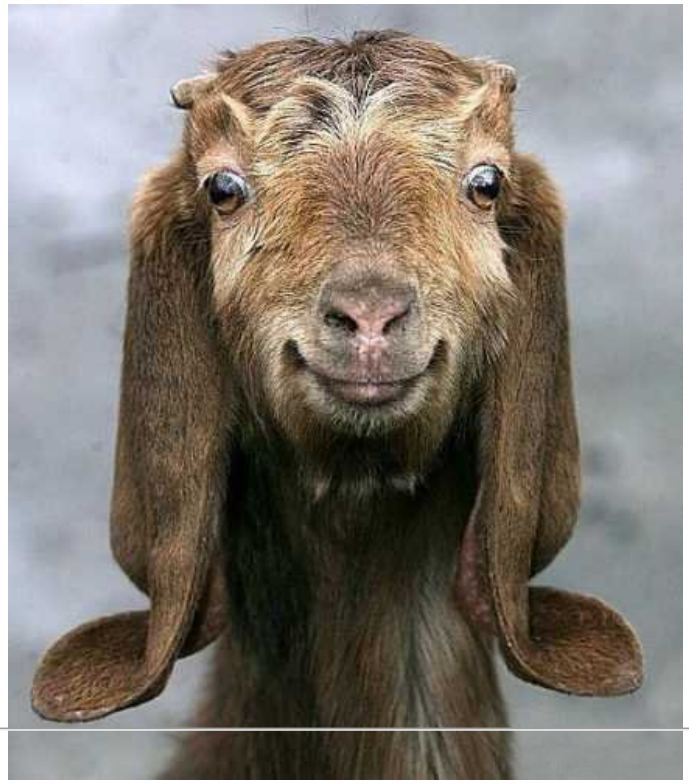



جیسے اپنی اہمیت سے واقف ہو۔ ابا جان یہی ہے یہی ہے ہم خوشی سے دیوانے ہوگ ۔ بھاؤ تاؤ کے لمبے اور تکلیف دہ دورانیہ کے بعد بکرے کی رسی ہمارے ھاتھ آئ ۔ ابا جان مستقل بڑبڑ ارہے تھے

کہ سونے کے سینگ لگے ہیں جو اتنا مہنگا دیا ہے بس ہماری ضد سے مجبور ہوگا ۔ اب اگلا مرحلہ اس بکرے کو گھر لے کر جانے کا تھا ۔ ابا جان نے مجھے اور بکرے کو دو لوگوں کی مدد سے رکشہ پر سوار کرایا ۔ اور خود اسکوٹر پر پھیچے پھیچے ہوا ۔ ٹھنڈی ہوا کا اثر تھا کہ بکرے صاحب نے کچھ ہلنا جلنا شروع کردیا اور تھوڑا رسی گھسیٹنے لگے ہم نے رکشے والے کو کہا بھیا زرا تیز چلاؤ گھر قریب آگیا ہے بکرے کے تیور کچھ ٹھیک نہیں لگ رہے ۔ جیسے ہی ہم نے اپنی گلی کا ٹرن کاٹا پتہ نہیں کیسے بکرے میاں نے ایک اڑان بھری اور رکشے سے باہر ۔ ہم ابھی صورتحال کا جائزہ لے رہے تھے کہ ابا جان کی آواز کان میں پڑی ۔ پھیچے بھاگو شہیر ۔ بکرا تو گیا ۔ بس آؤ دیکھا نہ تاؤ ھم بھی اس کے پھیچے بھاگے ۔ اچانک بکرے نے بریکیں لگائیں اور پلٹ کر ہماری طرف رخ کرکے کھڑا ہو گیا اور اپنے پاؤں کے کھر زمین پر مارنے لگا ھم نے سکینڈ کے ہزارویں حصے میں اس کی نیت جان لی اور پلٹ کر بھاگے اب صورتحال یہ تھی کے ھم آگے تھے اور بکرا اپنی بڑی بڑی سینگوں کا رخُ کا ہماری طرف دوڑا چلا آرہا تھا۔ ہماری سانس بھاگ بھاگ کر نہ اندر تھی نہ باہر آخر ایک گھر کا دروازہ ہمیںکھلا دکھا اور ہم لپک کر اندر گھس گ خیر سے وہ ہمارا ہی گھر تھا ۔ کچھ پتہ نہیں کہ ابا جان نے بکرے کو کیسے قابو کیا بس اس وقت تو ہم سب بھول بیٹھے تھے ۔ دوسرے دن کچھ ہوش ٹھکانے آ تو باہر آکر بکرے کو دیکھا جسے تین رسیوں سے باندھا گیا تھا اور وہ کھانا کہلانے والوں کو بھی قریب نہیں آنے دے رہا تھا ۔ مورل آف اسٹوری یہ ہے کہ ھمیشہ بڑوں کا کہنا ماننا چاہیے کیونکہ ان کی ہر بات میں حکمت ہوتی ہے ۔ بے جا ضد کا انجام یہی ہوتا ہے۔ حرما رضوان

§§§

## آشیانہ

# ہائے میرا بچپن!!!!

مصنف: یوسف

بچپن کاحساب کچھ یوں ہے کہ جوں جوں انسان بچپن کی طرف بڑھتا جا تا ہے بچپن زیادہ یاد آنا شروع ہوجا تا ہے ۔ یوں تو ایک خاص دور کے بچوں کا بچپن تقریبا یکساں ہی ہو تا ہے مگر چونکہ ہر فرد منفرد ہے تو ہر ایک کی علیحدہ کہانی ہو گی۔ آج سے تین چار عشرے قبل کے بچے معصوم ہوا کرتے تھے مگر ہم کچھ زیادہ ہی تھے یا پھر شریر بھائیوں کی موجودگی کی وجہ سے بنا دیے گئے تھے۔

ایک واقعہ یاد آ رہا ہے جو کچھ یوں ہے کہ اس وقت ہماری عمر سات آٹھ سال ہوگی۔جب ایک دن صبح دادی جان نے ہمیں چونی (آج کے بچوں کوکیا معلوم؟ ان کے لئے عرض ہے کہ چونی ایک روپے کا چوتھائی یعنی چار آنے ہوتے تھے۔ آج کے دس روپوں کے ہم پلہ سمجھ لیں )دی کہ سامنے والے کھوکھے سے انڈے لے آ ؤ۔ ہماری باچھیں کھل اٹھیں اور اپنے پچھلے دن کے بارے میں سوچنے لگے کہ دادی کی اس خاص مہربا نی ہماری کس بات کا انعام ہے! جلدی سے sweet egg کا ڈبہ ( یہ ہمارے بچپن کی خاص چیز تھی ۔ میٹھی باریک انڈوں کی شکل کی گولیاں جو ایک موبائیل کے سائز کے ڈبے میں ہوتی تھیں۔اس ڈبے پر چھتری تلے مرغی کی تصویر ہوتی تھی ہلانے پر لطیفہ بنناا س وقت تودلچسپ لگ رہا ہے مگر اُس عمر میں تو رو رو کر برا حال ہوتا جب بھی ہنس ہنس کر یہ واقعہ سنا یا جاتا۔

جہاں تک شوق کا معاملہ ہے ہر بچے کی طرح ہمیں بھی کہا نیاں سننابہت پسند تھا۔دادی جان سال کا آ دھا حصہ ہمارے گھر اور بقیہ آ دھا بڑے ابّا کے گھر حید رآ باد میں گزارتی تھیں ۔ بچوں اور بوڑھوں کی دوستی تو ویسے بھی ضرب المثل ہے کیونکہ ان دونوں اقوام کو ہی اصول و قواعد کے کڑے امتحان سے گزرنا پڑ تا ہے ہیں اور جو 'لوگ کیا کہیں گے !'کے بجائے' جہاں اور جیساہے' کی پالیسی پر یقین رکھتی ہیں۔ لہذا ہم بھی اپنی دادی جان کا انتظار ان کے جاتے ہی شروع کر دیتے تھے۔ اہم ترین وجہ ان کی کہانیاں ہوتیں جو ہم رات کو ان کے بستر کے گرد بیٹھ کر سنا کر تے تھے۔ چونکہ پڑھنے اور خصو صا کہانیاں پڑ ھنے کے بہت شو قین تھے ۔اسلئے موسم اور حالات کی پرواہ کئے بغیر دیواروں پر لکھے اشتہارات تک بڑے غور سے پڑھتے۔اس چکر میں بعض انہونی نہ ہوسکی کہ کئی دفعہ ہم بازار میں بچھڑنے سے بچے۔

نیک پر یوں کی کہانیاں بے دریغ پڑ ھنے سننے کا نتیجہ تھا کہ ہم عام زندگی میں بھی کہا نیوں کی تیکنک استعمال کر نے کی کو شش کر تے تھے۔یعنی یہ دیکھ کر کہ برادران امی کو ستا رہے ہیں۔کبھی بات نہ مان کر تو کبھی شرارتوں میں !محلے والوں کی شکایتیں سن کر امی بے چاری پریشان ہو رہی ہیں۔ اس معاملے میں ہمارے نہ کوئی اختیارات تھے نہ حقوق! نہ وسائل نہ طاقت ! ہاں مگر ایک ہتھیار تھا! قلم کی قوت ! کسی پری کی طرف سے اپنے اس بھائی کے نام خط لکھتے جس نے کوئی نامعقول حر کت کی ہو۔ مدعا یہ ہو تا کہ تم نے فلاں فلاں غلط حر کت کی ہے لہذاتمہیں میری طرف سے انعام نہیں ملے گا... .... اب آپ خود سو چیں ایک بری سی ہینڈ رائٹنگ میں بچگانہ اسٹائل میں کی گئی بات کتنے مزاح کا باعث بنتی ہوگی ؟ اس وقت آپ سے یہ شئیر کر نا اتنا برا نہیں لگ رہا مگر اس وقت بڑی شر مندگی لگتی تھی حالانکہ یہ تذ کرہ ہماری تعریف میں ہی ہو تا تھا۔بذریعہ قلم اصلاح معاشرہ کے جراثیم ہمارے اندر گویا شروع سے ہی تھے۔ہاں شعوری طور پر جب اس کا آ غاز کیا تو ظاہر ہے اس کی آ رہی مگر اس وقت واقعی بہت بڑی چیزیں لگ رہی تھیں۔ ذرا آٹھ سالہ بچے کے ذہن سے سو چیں!اور صورت حال کچھ یوں تھی کہ ہم شہر کے مضا فاتی علاقے میں رہتے تھے بارہ میل دور ! جہاں آ ج کل بڑے بڑے شاپنگ سنٹرز، دفاتر اور تعلیمی ادارے ہیں وہاں گھنا جنگل تھا ہوا کر تا تھا سڑک کے دونوں جانب! نز دیک ترین شاپنگ سینٹر صدر ہوا کر تا تھاجہاں صرف اسٹاف بس کے ذریعے جا یا جا سکتا تھا جو مقررہ اوقات میں ہی چلا کر تی تھی۔ امی جان پہلی بس سے ہی ہمارا سامان لانے روانہ ہو گئیں ۔

اس سامان کو دیکھ کر جو کیفیت ہوئی وہ آج بھی یاد ہے۔خو شی بھرا اضطراب! جیسے عید کا انتظار ہوتا ہے کپڑے اور جوتے سامنے رکھ کر! جب مطلوبہ پیریڈ شروع ہوا تو کچھ یوں منظر نامہ تھا کہ تقریباً پچیس بچوں اور بچیوں میں سے ہم واحد تھے جو پینٹنگ کا سامان لے کر آ ئے تھے باقی سب خالی ہاتھ سر جھکائے کھڑے تھے۔ ٹیچر نے پوری کلاس کو نافرمان کا خطاب دیا اور ہمیں اپنی میز پربلا کر ڈرائنگ سکھانے لگیں ۔ جس وقت وہ ہم پر تعریف کے ڈونگے بر سا رہی تھیں اسی وقت پرنسپل بھی کاریڈور سے گزریں ۔ٹیچر نے انہیں بتایا تووہ بھی ہماری کلاس کو ڈانٹنے لگیں۔ اچھی طرح یاد ہے کہ اس وقت ذرا بھی فخریہ احساس نہیں تھا۔یوں تواپنی تعریف ہر ایک کو پسندہوتی ہے مگر اس طرح نمایاں ہونے میں انسان کتنا تنہاسا ہو جاتا ہے!!! کیا خیال ہے؟شام کو اپنے پڑوسی ہم جماعت کے گھر کھیل رہے تھے۔ اس نے اپنی امی سے شکایت کی کہ مجھے رنگ کیوں نہیں منگواکر دیئے آپ نے.....! اور جناب ہمارے سامنے ہی اسکی بڑی بہن نے اس کے کان اینٹھے یہ کہہ کر '' تم خود کتنے خراب لڑ کے ہو! تمہیں کچھ آ تا بھی ہے! اس کو دیکھو کتنی اچھی بچی ہے .....'' یقین کریں میرا دل چاہ رہا تھا میں اپنے رنگ اسے دے دوں ! اب اس وقت کے درست جذبات تو ذہن میں نہیں ہیں مگر اب سو چتے ہیں کیا حقیقی تعریف کی حقدار میری امی نہیں تھیں جنہوں نے مجھے مطلوبہ چیزیں اہمیت کے ساتھ مہیا کیں ؟؟آج ہم اس بات کا اظہار کر رہے ہیں مگر اس وقت تو یقینا امی کا شکریہ ادا نہیں کیا ہو گا!

میٹھے انڈے ہتھیلی پر گرتے تو بس... .....کیا مصیبت ہے ! بچپن کاحال لکھیں تو ہر چیز explain کر کے بتائیں کہ آج وہ چیزیں ہی ناپیدہوگئیں)بھاگ کر لائے اور لان میں ہی بیٹھ کر کھانے لگے ایسا نہ ہو کہ برادران میں سے کوئی اچک لے اور خواہ مخواہ بٹوارا کر نا پڑے! بڑوں کی دھونس تو چھوٹوں کی ضد دونوں ہی خطر ناک تھے اس معاملے میں ! ڈبہ ختم کر کے جب اندر آ ئے تو دادی نے ہمارے خالی ہاتھ کو دیکھا اور انڈوں کا پوچھاتو صورت حال واضح ہوئی کہ وہ بیچاری آملیٹ کے لئے پیاز کاٹ کر منتظر تھیں کہ ہمارے آنے پر نا شتے کا ا نتظام ہو! جی نہیں ! ڈانٹ نہ پٹائی کچھ بھی نہ ہوا ہاں مگر اپنا بنیاد کوئی مہر بان ،نیک پری نہیں بلکہ رضائے الٰہی ہوگئی۔

بچپن کا ایک واقعہ جو یاد آ تا ہے اس وقت کا ہے جب ہم جماعت سوم میں پڑھتے تھے ۔ہماری آ رٹ ٹیچر نے اعلان کیا کہ آ ئندہ وہ ہمیں واٹر کلرسکھائیں گی ۔ہر بچے کی طرح ہمیں بھی ڈرائنگ سے بڑاشغف تھا۔ لہذا گھر پہنچتے ہی امی کو یہ خوشی بھری اطلاع دی اور ساتھ ہی وہ فہرست بھی پکڑائی جو مس نے منگوائی تھی۔ پینٹ برش اور رنگ کے علاوہ رنگ گھولنے کے لئے پلاسٹک کے پیالے ، ایپرن اور فالتو کپڑے وغیرہ۔ آج تو اس میں سے کوئی بھی چیز پہنچ سے باہر نظر نہیں اس واقعے کاڈراپ سین یہ ہوا کہ ہمارے چھوٹے بھائی نے جو ابھی اسکول نہیں جاتے تھے ایک دن موقع پاکر تمام رنگ خراب کر دیے ۔

اسکول سے و اپسی پر جب ہم نے دیکھا تو جو رونا شروع کیا وہ کئی دنوں بعد ہی ختم ہو سکا۔ یہ انسانی فطرت ہے جب کوئی نعمت ملتی ہے تو اپنے آپ کو اس کا حق دار سمجھتا ہے اور جب چھن جائے تو واویلا کرتا ہے .

بچپن کی یادوں میں ایک اہم واقعے میں بجھّو کا شکریہ!یہ کیا با ت ہوئی یہ تو انسان کو تکلیف دینے والاشش پایہ ہے جو احسان کا جواب بھی ڈنک مار کر دیتا ہے اس کا شکریہ کیوں ؟؟

## آشیانہ

قصہ کچھ یوں ہے کہ ہم سارے بچے اسکول بس کے ذریعے اپنے اپنے اسکول جا یاکر تے تھے ۔یہ رواج تو آ ج بھی ہے کہ بچے شہر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک جاتے ہیں ۔فرق یہ ہے کہ اس زمانے میں دور دراز جانے کی وجہ اسکولوں کا گھروں سے فاصلے پرہونا ہوتا تھا اسٹینڈرڈ ہر گز نہیں تھے۔

تو جناب ! ہماری ایک بس کی ساتھی نے ایک دن ہمیں بتا یا کہ ان کے اسکول میں اردو پاکستانی فلم دکھائی جائے گی۔اس زمانے کے بچوں اور نوجوان نسل کے لئے سینما جاکر فلم دیکھنا بہت بڑی تفریح ہوا کر تی تھی اسج کی طرح نہیں کہ فلم just a click پر ہو!بہت سے خاندانوں میں یہ شجر ممنوعہ ہوا کر تی تھی ۔شیطان اس وقت بھی اپنے تمام حربوں کے ساتھ میدان میں ہو تا تھا لہذا مختلف تعلیمی اداروں میں اس کو دکھانے کااہتمام کیا جاتا کہ کوئی محروم نہ رہے۔ ساتھی کی اس خبر پر ہمارا بھی بہت دل للچا یا اور نہ جا نے کس طرح امی سے اجازت اور ٹکٹ کے پیسے لئے یہ غیر ضروری بات ہے۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ اس دن ہم اپنی دوست کے اسکول میں فلم دیکھنے جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔جوتا پہنتے ہوئے بری طرح تکلیف ہونے لگی جب ہمارا جوتا اتر وایا گیا توہاں بجھّو صاحب آرام فر مارہے تھے اورہمارے انگوٹھے پر ڈنک مار مار کر ہمارا شکریہ ادا کر رہے تھے۔آگے آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں !ہمیں فوری طور پر ٹریٹمنٹ دی گئی ۔تکلیف اور فلم نہ دیکھنے کا افسوس ساتھ ساتھ رہے۔یہ واقعہ پڑھ کر آپ کو یقین آگیا ہوگا کہ ہم نے اس کاشکریہ درست ادا کیاتھاکہ اس نے ہمیں ڈنک مار کر فلم دیکھنے سے بچا کر نہ صرف ہماری معصو میت کوداغدار ہونے سے بچایا بلکہ سنّت کے مطابق چیزوں کو جھاڑ کر استعمال کر نے کی عادت ڈلوائی

میرا خیال ہے کہ بچپن نمبر کے لئے اتنے ہی واقعات بہت ہیں !ہمارا بچپن ہمارے دور کی جھلک ہے ! کیسا لگا یہ دور؟؟

§§§

# حکیم صاحب

مصنف: یوسف

پنجاب کے شہر گجرانولا میں ایک حکیم صاحب ہوا کرتے تھے، جن کا مطب ایک پرانی سی عمارت میں ہوتا تھا۔ حکیم صاحب روزانہ صبح مطب جانے سے قبل بیوی کو کہتے کہ جو کچھ آج کے دن کے لیے تم کو درکار ہے ایک چٹ پر لکھ کر دے دو۔ بیوی لکھ کر دے دیتی۔ آپ دکان پر آ کر سب سے پہلے وہ چٹ کھولتے۔ بیوی نے جو چیزیں لکھی ہوتیں۔ اُن کے سامنے اُن چیزوں کی قیمت درج کرتے، پھر اُن کا ٹوٹل کرتے۔ پھر اللہ سے دعا کرتے کہ یااللہ! میں صرف تیرے ہی حکم کی تعمیل میں تیری عبادت چھوڑ کر یہاں دنیا داری کے چکروں میں آ بیٹھا ہوں۔ جوں ہی تو میری آج کی مطلوبہ رقم کا بندوبست کر دے گا۔ میں اُسی وقت یہاں سے اُٹھ جائوں گا اور پھر یہی ہوتا۔ کبھی صبح کے ساڑھے نو، کبھی دس بجے حکیم صاحب مریضوں سے فارغ ہو کر واپس اپنے گاؤں چلے جاتے۔

ایک دن حکیم صاحب نے دکان کھولی۔ رقم کا حساب لگانے کے لیے چِٹ کھولی تو وہ چِٹ کو دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ گئے۔ ایک مرتبہ تو ان کا دماغ گھوم گیا۔ اُن کو اپنی آنکھوں کے سامنے تارے چمکتے ہوئے نظر آ رہے تھے لیکن جلد ہی انھوں نے اپنے اعصاب پر قابو پا لیا۔ آٹے دال وغیرہ کے بعد بیگم نے لکھا تھا، بیٹی کے جہیز کا سامان۔ کچھ دیر سوچتے رہے پھشکر۔'' چیزوں کی قیمت لکھنے کے بعد جہیز کے سامنے لکھا ''یہ اللہ کا کام ہے اللہ جانے۔''

ایک دو مریض آئے ہوئے تھے۔ اُن کو حکیم صاحب دوائی دے رہے تھے۔ اسی دوران ایک بڑی سی کار اُن کے مطب کے سامنے آ کر رکی۔ حکیم صاحب نے کار یا صاحبِ کار کو کوئی خاص توجہ نہ دی کیونکہ کئی کاروں والے ان کے پاس آتے رہتے تھے۔

دونوں مریض دوائی لے کر چلے گئے۔ وہ سوٹڈبوٹڈ صاحب کار سے باہر نکلے اور سلام کرکے بنچ پر بیٹھ گئے۔ حکیم صاحب نے کہا کہ اگر آپ نے اپنے لیے دوائی لینی ہے تو ادھر سٹول پر آجائیں تاکہ میں آپ کی نبض دیکھ لوں اور اگر کسی مریض کی دوائی لے کر جانی ہے تو بیماری کی کیفیت بیان کریں۔

وہ صاحب کہنے لگے حکیم صاحب میرا خیال ہے آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ لیکن آپ مجھے پہچان بھی کیسے سکتے ہیں؟ کیونکہ میں ۱۵، ۱۶ سال بعد آپ کے مطب میں داخل ہوا ہوں۔ آپ کو گزشتہ ملاقات کا احوال سناتا ہوں پھر آپ کو ساری بات یاد آجائے گی۔ جب میں پہلی مرتبہ یہاں آیا تھا تو وہ میں خود نہیں آیا تھا۔ خدا مجھے آپ کے پاس لے آیا تھا کیونکہ خدا کو مجھ پر رحم آگیا تھا اور وہ میرا گھر آباد کرنا چاہتا تھا۔ ہوا اس طرح تھا کہ میں لاہور سے میرپور اپنی کار میں اپنے آبائی گھر جا رہا تھا۔ عین آپ کی دکان کے سامنے ہماری کار پنکچر ہو گئی۔

ڈرائیور کار کا پہیہ اتار کر پنکچر لگوانے چلا گیا۔ آپ نے دیکھا کہ میں گرمی میں کار کے پاس کھڑا ہوں۔ آپ میرے پاس آئے اور آپ نے مطب کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ ادھر آ کر کرسی پر بیٹھ جائیں۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ میں نے آپ کا شکریہ ادا کیا اور کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔

ڈرائیور نے کچھ زیادہ ہی دیر لگا دی تھی۔ ایک چھوٹی سی بچی بھی یہاں آپ کی میز کے پاس کھڑی تھی اور بار بار کہہ رہی تھی ''چلیں ناں، مجھے بھوک لگی ہے۔ آپ اُسے کہہ رہے تھے بیٹی تھوڑا صبر کرو ابھی چلتے ہیں۔

میں نے یہ سوچ کر کہ اتنی دیر سے آپ کے پاس بیٹھا ہوں۔ مجھے کوئی دوائی آپ سے خریدنی چاہیے تاکہ آپ میرے بیٹھنے کو زیادہ محسوس نہ کریں۔ میں نے کہا حکیم صاحب میں ۵،۶ سال سے انگلینڈ میں ہوتا ہوں۔ انگلینڈ جانے سے قبل میری شادی ہو گئی تھی لیکن ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم ہوں۔ یہاں بھی بہت علاج کیا اور وہاں انگلینڈ میں بھی لیکن ابھی قسمت میں مایوسی کے سوا اور کچھ نہیں دیکھا۔

آپ نے کہا میرے بھائی! توبہ استغفار پڑھو۔ خدارا اپنے خدا سے مایوس نہ ہو۔ یاد رکھو! اُس کے خزانے میں کسی شے کی کمی نہیں۔ اولاد، مال و اسباب اور غمی خوشی، زندگی موت ہر چیز اُسی کے ہاتھ میں ہے۔ کسی حکیم یا ڈاکٹر کے ہاتھ میں شفا نہیں ہوتی اور نہ ہی کسی دوا میں شفا ہوتی ہے۔ شفا اگر ہونی ہے تو اللہ کے حکم سے ہونی ہے۔ اولاد دینی ہے تو اُسی نے دینی ہے۔

مجھے یاد ہے آپ باتیں کرتے جا رہے اور ساتھ ساتھ پڑیاں بنا رہے تھے۔ تمام دوائیاں آپ نے ۲ حصوں میں تقسیم کر کے ۲ لفافوں میں ڈالیں۔ پھر مجھ سے پوچھا کہ آپ کا نام کیا ہے؟ میں نے بتایا کہ میرا نام محمد علی ہے۔ آپ نے ایک لفافہ پر محمد علی اور دوسرے پر بیگم محمد علی لکھا۔ پھر دونوں لفافے ایک بڑے لفافہ میں ڈال کر دوائی استعمال کرنے کا طریقہ بتایا۔ میں نے بے دلی سے دوائی لے لی کیونکہ میں تو صرف کچھ رقم آپ کو دینا چاہتا تھا۔ لیکن جب دوائی لینے کے بعد میں نے پوچھا کتنے پیسے؟ آپ نے کہا بس ٹھیک ہے۔ میں نے زیادہ زور ڈالا، تو آپ نے کہا کہ آج کا کھاتہ بند ہو گیا ہے۔

میں نے کہا مجھے آپ کی بات سمجھ نہیں آئی۔ اسی دوران وہاں ایک اور آدمی آچکا تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ کھاتہ بند ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آج کے گھریلو اخراجات کے لیے جتنی رقم حکیم صاحب نے اللہ سے مانگی تھی وہ اللہ نے دے دی ہے۔ مزید رقم وہ نہیں لے سکتے۔ میں کچھ حیران ہوا اور کچھ دل میں شرمندہ ہوا کہ میرے کتنے گھٹیا خیالات تھے اور یہ سادہ سا حکیم کتنا عظیم انسان ہے۔ میں نے جب گھر جا کر بیوی کو دوائیاں دکھائیں اور ساری بات بتائی تو بے اختیار اُس کے منہ سے نکلا وہ انسان نہیں کوئی فرشتہ ہے اور اُس کی دی ہوئی ادویات ہمارے من کی مراد پوری کرنے کا باعث بنیں گی۔ حکیم صاحب آج میرے گھر میں تین پھول اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔

ہم میاں بیوی ہر وقت آپ کے لیے دعائیں کرتے رہتے ہیں۔ جب بھی پاکستان چھٹی آیا۔ کار اِدھر روکی لیکن دکان کو بند پایا۔ میں کل دوپہر بھی آیا تھا۔ آپ کا مطب بند تھا۔ ایک آدمی پاس ہی کھڑا ہوا تھا۔ اُس نے کہا کہ اگر آپ کو حکیم صاحب سے ملنا ہے تو آپ صبح ۹ بجے لازماً پہنچ جائیں ورنہ اُن کے ملنے کی کوئی گارنٹی نہیں۔ اس لیے آج میں سویرے سویرے آپ کے پاس آگیا ہوں۔

محمد علی نے کہا کہ جب ۱۵ سال قبل میں نے یہاں آپ کے مطب میں آپ کی چھوٹی سی بیٹی دیکھی تھی تو میں نے بتایا تھا کہ اس کو دیکھ کر مجھے اپنی بھانجی یاد آرہی ہے۔

حکیم صاحب ہمارا سارا خاندان انگلینڈ سیٹل ہو چکا ہے۔ صرف ہماری ایک بیوہ بہن اپنی بیٹی کے ساتھ پاکستان میں رہتی ہے۔ ہماری بھانجی کی شادی اس ماہ کی ۲۱ تاریخ کو ہونا تھی۔ اس بھانجی کی شادی کا سارا خرچ میں نے اپنے ذمہ لیا تھا۔ ۱۰ دن قبل اسی کار میں اسے میں نے لاہور اپنے رشتہ داروں کے پاس بھیجا کہ شادی کے لیے اپنی مرضی کی جو چیز چاہے خرید لے۔ اسے لاہور جاتے ہی بخار ہوگیا لیکن اس نے کسی کو نہ بتایا۔ بخار کی گولیاں ڈسپرین وغیرہ کھاتی اور بازاروں میں پھرتی رہی۔ بازار میں پھرتے پھرتے اچانک بے ہوش ہو کر گری۔ وہاں سے اسے ہسپتال لے گئے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ اس کو ۱۰۶ ڈگری بخار ہے اور یہ گردن توڑ بخار ہے۔ وہ بے ہوشی کے عالم ہی میں اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئی۔

اُس کے فوت ہوتے ہی نجانے کیوں مجھے اور میری بیوی کو آپ کی بیٹی کا خیال آیا۔ ہم میاں بیوی نے اور ہماری تمام فیملی نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم اپنی بھانجی کا تمام جہیز کا سامان آپ کے ہاں پہنچا دیں گے۔ شادی جلد ہو تو اس کا بندوبست خود کریں گے اور اگر ابھی کچھ دیر ہے تو تمام اخراجات کے لیے رقم آپ کو نقد پہنچا دیں گے۔ آپ نے ناں نہیں کرنی۔ آپ اپنا گھر دکھا دیں تاکہ سامان کا ٹرک وہاں پہنچایا جا سکے۔

حکیم صاحب حیران و پریشان یوں گویا ہوئے ''محمد علی صاحب آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں مجھے سمجھ نہیں آرہا، میرا اتنا دماغ نہیں ہے۔ میں نے تو آج صبح جب بیوی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی چِٹ یہاں آ کر کھول کر دیکھی تو مرچ مسالہ کے بعد جب میں نے یہ الفاظ پڑھے ''بیٹی کے جہیز کا سامان'' تو آپ کو معلوم ہے میں نے کیا لکھا۔ آپ خود یہ چِٹ ذرا دیکھیں۔ محمد علی صاحب یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ''بیٹی کے جہیز'' کے سامنے لکھا ہوا تھا ''یہ کام اللہ کا ہے، اللہ جانے۔''

محمد علی صاحب یقین کریں، آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ بیوی نے چِٹ پر چیز لکھی ہو اور مولا نے اُس کا اسی دن بندوبست نہ کردیا ہو۔ واہ مولا واہ۔ تو عظیم ہے تو کریم ہے۔ آپ کی بھانجی کی وفات کا صدمہ ہے لیکن اُس کی قدرت پر حیران ہوں کہ وہ کس طرح اپنے معجزے دکھاتا ہے۔

حکیم صاحب نے کہا جب سے ہوش سنبھالا ایک ہی سبق پڑھا کہ صبح ورد کرنا ہے ''رازق، رازق، تو ہی رازق'' اور شام کو ''شکر، شکر مولا تیرا شکر

§§§

# اردو ادب کاایک نام۔ ابن انشاء

مصنف: یوسف

اردو ادب کے مایہ ناز شاعر ، ادیب ابن انشاء کا اصلی نام شیر محمد خان تھالیکن ابن انشا ء کے نام سے مشہور ہوئے ۔ 15 جون 1927 ء کوجالندھر کے ایک نواحی گاؤں کے راجپوت گھرانے میں پیدا ہوئے ۔ والد کا نام منشی خان تھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کے سکول میں، مڈل نزدیکی گاؤں کے سکول سے اور 1941ء میں گورنمنٹ ہائی سکول لدھیانہ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا ،میٹرک میں اول پوزیشن حاصل کی ۔ابن انشا ء کوصحافت ،علم و ادب سے دلچسپی تھی، اس وقت " نوائے وقت " ہفت روزہ تھا ،حمید نظامی صاحب سے خط و کتابت تھی، انہوں نے ایک خط میں مجید نظامی صاحب ( مرحوم) سے لاہور آ کر "نوائے وقت" میں ملازمت اختیار کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ حمید نظامی کے مشورے پر ابن انشا ء لاہور آ گئے اور اسلامیہ کالج لاہور میں فرسٹ ایئر میں داخلہ لے لیا، ان کی رہائش کا بندوبست جناب حمید نظامی نے کیا مگر تین مہینے کے مختصر قیام کے بعد ابن انشاء اپنی طبیعت کے مطابق اور کچھ دیگر وجوہات کے سبب تعلیم ادھوری چھوڑ کر لدھیانہ چلے گئے ۔

وہاں بھی بھنورے نے کہاں رہنا تھا، لدھیانہ سے انبالہ چلے گئے، وہاں ملٹری اوکاونٹس کے دفتر میں ملازمت اختیار کرلی ۔لیکن جلد ہی یہ ملازمت بھی چھوڑ دی اور دلی چلے گئے ۔ اس دوران میں آپ نے ادیب فاضل اور منشی فاضل کے امتحانات پاس کرنے کے بعد پرائیویٹ طور پر بی اے کا امتحان پاس کرلیاتھا۔ابن انشا ء ذہین تھے ،تھوڑے عرصے بعد انہیں اسمبلی ہاوس میں مترجم کی حیثیت سے ملازمت مل گئی۔ بعد از اں آل انڈیا ریڈیو کے نیوز سیکشن میں خبروں کے انگریزی بلیٹن کے اردو ترجمے پر مامور ہوئے اور قیام پاکستان تک وہ آل انڈیا ریڈیو ہی سے وابستہ رہے ۔آپ کی پہلی شادی 1941ء میں لدھیانہ میں عزیزہ بی بی سے ہوئی، عزیزہ بی بی سے ا بن انشا ء کا ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہوئی، بعد از اں گھریلو ناچاکی کے سبب دونوں کی طبیعت میں فرق کے سبب عزیزہ بی بی اورابن انشا ء میں علیحدگی ہو گئی، مگر طلاق نہ ہوئی، لہٰذا عزیزہ بی بی نے باقی تمام عمر ان کی بیوی کی حیثیت ہی سے زندگی بسر کی لیکن ان سے الگ رہیں۔

جب پاکستان بنا تو ابن انشاء اپنے اہل خانہ کے ساتھ ہجرت کرکے پاکستان آ گئے اور لاہور میں رہائش اختیار کر لی، انڈیا میں ریڈیو سے منسلک رہے تھے، اس لیے بھاگ دوڑ کر کے 1949ء میں وہ ریڈیو پاکستان کراچی کے نیوز سیکشن سے بطور مترجم منسلک ہوئے ۔کام کے سلسلے میں کراچی جانا ہوا، اپنی ادھوری تعلیم مکمل کرنے کا خیال آیا تو انہوں نے اردو کالج کراچی میں 1951ء میں ایم اے اردو کی شام کی جماعتوں میں داخلہ لے لیا اور 1953ء میں ایم اے کا امتحان کیا پہلی پوزیشن حاصل کی۔ ایم اے کرنے کے بعد ڈاکٹریٹ کیلئے تحقیقی کام کرنے کا سوچا بھاگ دوڑ کر کے مارچ 1954ء میں بعنوان ( اردو نظام کا تاریخی و تنقیدی جائزہ (آغاز تا حال) کا مقالہ ملا مگر وہ اپنے اس مقالے کو مکمل نہ کر سکے کچھ عرصہ کراچی میں گزارنے کے بعد لاہور تشریف لے آئے۔دور جدید کے مسائل سے بھی ابن انشاء آگاہ تھے ،اس کے لیے کالم نگاری کا راستہ اختیار کیا ۔ وہ مختلف اخباروں کے لیے بڑی پابندی سے کالم لکھا کرتے تھے اور اپنی بے باک رائے پیش کیا کرتے تھے۔کالم نگاری آخری عمر تک جاری رہی ۔

ابن انشا ء نے 1960ء میں روزنامہ ''امروز'' کراچی میں درویش دمشقی کے نام سے کالم لکھنا شروع کیا۔ 1965ء میں روزنامہ ''انجام'' کراچی اور 1966ء میں روزنامہ جنگ سے وابستہ گی اختیار کی جو ان کی وفات تک جاری رہی۔دو شعری مجموعے ، چاند نگر اور اس بستی کے کوچے میں 1976ء شائع ہوچکے ہیں۔ 1960ء میں چینی نظموں کا منظوم اردو ترجمہ (چینی نظمیں) شائع ہوا۔

کیا جھگڑا سود خسارے کاا
یہ کاج نہیں بنجارے کا
تم ایک مجھے بہتیری ہو
اِک بار کہو تم میری ہو

ابن انشا ء 1962 ء میں نیشنل بک کونسل کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے ۔ اس کے علاوہ ٹوکیو بک ڈویلپمنٹ پروگریم کے وائس چیرمین اور ایشین کو پبلی کیشن پروگریم ٹوکیو کی مرکزی مجلس ادارت کے رکن بھی مقرر ہوئے ۔ 1969ء میں آپ نے دوسری شادی کی دوسری بیگم کا نام شکیلہ بیگم تھا۔ دوسری بیوی سے آپ کے دو بیٹے سعدی اور رومی پیدا ہوئے ۔کسی حد تک یہ پسند کی شادی تھی ۔ابن انشا ء کی شاعری میں ایک جادو ہے۔ان کی بات ہی الگ ہے ۔کیا کمال کا شاعر تھا اور کیا کمال کی شاعری ہے ۔

دل ہجر کے درد سے بوجھل ہے ، اب آن ملو تو بہتر ہو
اس بات سے ہم کو کیا مطلب، یہ کیسے ہو، یہ کیونکر ہو
انشاء جی اب اجنبیوں میں چین سے باقی عمر کٹے
جن کی خاطر بستی چھوڑی نام نہ لو اُن پیاروں کا

ان کی چند کتابوں کے نام درج ذیل ہیں ۔آوارہ گرد کی ڈائری ۔دنیا گول ہے ۔ابن بطوطہ کے تعاقب میں۔چلتے ہو تو چین کو چلئے ۔نگری نگری پھرا مسافر۔آپ سے کیا پردہ ۔خمار گندم۔اردو کی آخری کتاب ۔خط انشا جی کے۔اس کے علاوہ آپ نے متعدد تراجم بھی کیے (اندھا کنواں اور دیگر پر اسرار کہانیاں ۔مجبور۔ لاکھوں کا شہر۔ شہر پناہ چینی نظمیں ، سانس کی پھانس، وہ بیضوی تصویر، ، عطر فروش دوشیزہ کے قتل کامعمہ، قصہ ایک کنوارے کا۔کارنامے ناب تیس مار خان کے ۔ شلجم کیسے اکھڑا بچوں کیلئے ایک پرانی روسی کہانی کا ترجمہ۔ یہ بچہ کس کا بچہ ہے ؟ ۔قصہ دم کٹے چوہے کا ۔ میں دوڑتا ہی دوڑتا''اختر کی یاد میں'' اور شاہ عبداللطیف بھٹائی کی سندھی شاعری کا اردو ترجمہ بھی کرنے کا بھی اعزاز ابن انشا ء نے ہی حاصل کیا۔

انشاء جی اٹھو اب کوچ کرو، اس شہر میں جی کو لگانا کیا
وحشی کو سکوں سے کیا مطلب، جوگی کا نگر میں ٹھکانہ کیا

انشا ء جی اٹھو اب کوچ کرو نظم کہنے کے ایک ماہ بعد ابن انشاء کی وفات ہوئی ۔اردو ادب کا یہ بے حد مقبول و اہم شاعر و ادیب ،مزاح نگار، جس نے اپنی زندگی کے زیادہ تر ایام حالانکہ اپنے شہر کراچی ، لاہور یعنی پاکستان میں گزارے ، مگر جب اجل کا وقت قریب آیا تو وہ اپنے وطن سے سات سمندر پار انگلستان میں مقیم تھے ۔وہیں انہوں نے 11 جنوری 1978ء کو لندن میں وفات پائی اور پاپوش نگر قبرستان،کراچی میں آسودہ خاک ہیں۔یہ عظیم شاعر و ادیب افسانہ نگار ابن انشاء جسمانی طور پر ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے رخصت ہوگیا ۔ اس دنیا سے رخصت ہوئے 39 برس بیت گئے ہیں مگر وہ اپنی تخلیقات کے ذریعہ آج بھی زندہ ہے۔

جب دیکھ لیاہر شخص یہاں ہرجائی ہے
اِس شہر سے دور
اِک کٹیا ہم نے بنائی ہے
اس اس کٹیا کے ماتھے پر لکھوایا ہے
سب مایا ہے۔۔۔!!!

§§§

# اقبال اور فلسفہ خودی

مصنف: یوسف

بیسویں صدی میں اسلامی فکر کے احیاء و تجدید میں شا عرِ مشرق علا مہ اقبال کا نام ایک روشن ترین مینار کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا بھر کی ادبی تاریخ میں بہت کم ایسی شخصیات ملتی ہیں جنھوں نے علامہ اقبال کی طرح ذہنوں پر اتنے گہرے اثرات مرتب کئے ہوں اور سیا سی و سماجی دھا رے کا رخ موڑ دیا ہو۔ انکا خطبہ الہ آباد ہندوستانی مسمانوں کی بیداری کی اساس بنا۔ علامہ اقبال نے پا کستان کا خواب دیکھا اور صاف صاف بتا یا دیا کہ ''خو دی کی تلوار'' سے مسلما نان ہند کا ایک الگ آزاد اسلامی ملک وجود میں آنے والا ہے۔ اقبال کا ہی احسان ہے اور کارنامہ بھی کہ قائد اعظم کو اس جدو جہد کا رہبر بننے پر را ضی کیا۔ علامہ انیس سو اڑتیس میں فوت ہوئے لیکن انکے افکار سے پاکستان، انڈیا، ایرا ن ،ترکی، افغانستان اور مشرق کے ساتھ ساتھ مغرب بھی استفا دہ کر رہا ہے۔ اقبال نے با لکل ٹھیک کہا تھا: کہ

ع اک ولولہء تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا بہ خاک بخارا و سمر قند

علامہ اقبال کی شا عری کا بنیا دی مرکز ''فلسفہء خودی ''ہے۔ انھوں نے خودی کے فلسفے کو اس قدر شا ندار اور بے مثال ا نداز میں پیش کیا ہے کہ اس پر غور و فکر کرنے اور پھر عمل کرنے سے نہ صرف فرد بلکہ اقوام بھی اپنی زندگیوں میں انقلابی تبدیلی لا سکتے ہیں۔ اور وہ شیطان کی پیروی کی بجائے ایک اللہ کی بندگی کی طرف لوٹ سکتے ہیں۔

اب ہم اس پر تفصل کے ساتھ بات کرتے ہیں۔

انسان کا وجود: انسان کا وجود دو چیزوں کا مجموعہ ہے۔ ایک اسکا بدن ہے، اسکا ''خاکی وجود'' ہے اور دوسری چیز اُسکی ''روح ''ہے۔

در حقیقت نسان ''خاکی وجود ''کے تقاضے پورے کرنے میں دن رات مصروف ہے۔ وہ اس عمل میں اتنا مگن ہو جا تا ہے کہ وہ اپنا ''اصل وجود'' اپنی 'روح ' کو بھول جا تا ہے۔ وہ کھانے، پینے، معاشی سر گرمی، خاندان کے ضروریات پورے کرنے اور دیگر انسانی معاملات میں بہت آگے نکل جا تا ہے۔ یوں آہستہ آہستہ و ہ مادہ پرست، دنیا پرست اور آخرکار شیطان کا کارکن بن جا تا ہے۔ وہ روح کے تقاضے پورے کرنا بھول جا تا ہے ۔ وہ دنیا کی بھول بھلیوں میں اپنے خالق، اپنے رب کو فراموش کر دیتا ہے۔ وہ دن رات مادی وجود کی پرستش کرنے لگتا ہے۔ یہ ''نفس آمارہ'' کی کیفیت ہے اور بہت بڑی تباہی ہے۔

انسانی روح کیا ہے؟

انسان کی اصل حقیقت اسکی پاکیزہ روح ہے۔ انسانی روح کی و جہ سے اسے مسجود ملائک کا درجہ ملا ہے۔ روح کا تعلق مذہب اور رحمانیت سے ہے۔ یہی روح اسے دیگر حیوانوں سے الگ کرتی ہے۔ جسم کے مرنے سے روح نہیں مرتی۔ وہ واپس اپنے خالق کی پاس چلی جاتی ہے۔ اور تب انسان دنیاوی ز ندگی کا جواب دہ ہو تا ہے۔ محض جسم کے تقاضے پورے کرنے سے '' روح'' کو چین نہیں مل سکتا۔

اقبال کا فلسفہء خودی ڈارون کی زہریلی تھیوری آف ہیومن ایویلویشن کا تریاق ہے:

ڈارون نے کہا تھا کہ انسان حیوان کی ترقیافتہ شکل ہے۔ حیوان اور انسان ایک ہی چیز ہے۔ بس انسان نے ذرا ترقی کی اور مو جودہ تہذیب تک پہنچا۔ اسکے مطابق انسان محض حیوانی جبلتوں کا حامل ہے۔ مان، بہن ، بیٹی اور بیوی میں کو ئی فرق نہیں۔ حیوان کی طرح انسان جس سے چاہے اور جب چاہے، جنسی اختلاط کر سکتا ہے۔ حیوانوں کی طرح انسانوں کا بھی کوئی مذہب نہیں ہونا چاہئے۔ گویا ''جانور'' انسان کا باوہ آدم ہے۔ چو نانچہ ''ڈارون ''کے اس تباہ کن نظریئے نے مذہب، ادب، اخلاقیات، شرف انسانیت کا جنازہ نکال دیا ہے ۔

اقبال کا ''فلسفہء خودی'' ڈارون کے اس تھیوری کا توڑ ہے ۔ اور اسکے زہریلے اثرات کا تریاق بھی ہے۔اقبال کی خودی کا فلسفہ انسان کو جانور سے بلند تر مخلوق بتاتا ہے۔ یہ ہمیں حیوانی طرز حیات سے بلند کر کے رحمانیت کا راستہ دِکھاتا ۔انسان کے خاکی وجود سے ماوراء بھی اسکی ایک عظیم ہستی ہے، جسے فنا نہیں۔انسان کی زندگی کا اصل مقصد اللہ کی خو شنو دی ہے۔

تو رازِ کن فکاں ہے، اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا راز داں ہو جا، خُدا کا ترجماں ہو جا

خو دی کی معنی: خودی کے دو معنٰی ہیں۔ ایک یہ کہ خودی محمود ہے، مقبول ہے ، قابل قبول ہے، قا بل ستائش ہے، اچھی چیز ہے۔ یہ ہر باطل سے استغنا ء اور بے نیا زی ہے۔ اس میں انسان اپنے اندر کی روشنی کو پہچاننے کی کو شش کرتا ہے، وہ اپنی اصلیت کی تلاش کرتا ہے۔ وہ نفس مطمئنہ سے بھی آگے کے سفر پر ریا ضت کرتا ہے اور وہ اپنے روحانی تقا ضوں کو پورا کرتا ہے اور یوں اپنے مالک، اپنے رب تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ خودی انسان کی انا ہے، عزت ہے ، غیرت ہے ، اسکی اندر کی ''میں'' ہے ، اسکی روح ہے۔ ا ور یہی ا سکی اصل پہچان ہے۔ خاکی وجود کے علاوہ جو اسکی روح ہے اسکی پہچان اور عرفان انسان کا اصل مقصد حیات ہے۔ اسی عرفان کی وجہ سے بندہ اپنے رب کی رضا کے لئے دن رات لگ جاتا ہے۔ حیوانی خواہشوں کی پوجا کی بجائے انسان اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق زندگی گزارتا ہے۔

اسکا ایک دوسرا مطلب بھی ہے :کہ انسان جب نفس امارہ کا پُجا ری بن جاتا ہے تو ایسے بندے کی خودی اسے حیوان کے برابر کر دیتی ہے۔ اس حالت میں انسان اپنے نفس کا غلام بن جاتا ہے۔ وہ اپنے اندر کی روشنی کو بھول کر اپنی دنیا پرستی اور ہوس پرستی کی وجہ سے خاکی وجود کی پرستش کرتا ہے۔ تب یہ خو دی بری چیز ہے، قا بل مذ مت ہے اور خودی کی یہ کیفیت بہت مذموم ہے۔

اقبال خود ی کو ان دو نوں مطالب میں استعمال کرتا ہے۔ وہ نفس اما رہ والی خودی کو ترک کرنے اور نفس مطمئنہ والی خودی کو اپنانے کی تلقین کرتا ہے ۔ ''طلوع سحر'' میں اقبال کہتا ہے:

خودی میں ڈوب جا غافل ! یہ سِر زندگانی ہے
نکل کر حلقہ شام و سحر سے جاوداں ہو جا

فلسفہء خودی کی اساس : علامہ اقبال کے فلسفہء خودی کا ماخذ قرآن حکیم کی 'سورۃ حشر آیت نمبر آٹھارہ ہے' ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم متعدد مرتبہ اپنے لیکچرز میں اس حقیقت کی گواہی دے چکے ہیں۔ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جب انسان اپنے پیدا کرنے والے ا ور تخلیق کرنے والے رب کو بھلا دیتا ہے، تو اللہ تعالیٰ بھی ایسے انسان کو اپنا آپ بھلا دیتا ہے۔ اللہ نے انسان کو پیدا کیا تا کہ وہ اپنے من میں ڈوب کر اپنے رب کو تلاش کرے ۔ وہ دیکھے کہ اسکی اصل حقیقت کیا ہے، ۔ ملائکہ سے اسکو سجدہ کروایا گیا ہے۔ وہ ایک بلند مخلوق ہے۔ وہ حیوان نہیں ہے بلکہ اللہ نے اسے اشرف الامخلوقات بنا یاہے لہذا وہ اپنی پاکیزہ روح کو پہچا نے۔ اپنے اندر جھا نکے تو اسے معلوم ہوگا کہ اسکی زندگی کا کوئی عظیم مقصد ہے۔ اس مقصد کے حصول میں اپنی زندگی گزارے۔ لیکن اگر انسان ایسا کرنے کی بجائے اپنے خالق کو بھول بھال کر نفس اما رہ کا غلام بن جائے، شیطان کا پُجاری ری بن جائے اور دن رات اپنے خاکی وجود کی ضرورتیں پوری کرنے میں لگ جائے تو پھر اللہ تعا لیٰ ایسے انسان کو اپنی رحمت اور ھدایت سے دور کر دیتا ہے، وہ مردود ہو جا تاہے۔ جوانسان اپنے رب کا نا شکرہ بن جا تا ہے، اللہ سے بے خوف ہو جاتا ہے تو اسکا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ اپنی اصلیت اور حقیقت کو بھی بھول جا تا ہے۔ پھر وہ نفس آمارہ اور نفس آوارہ

میں ڈوب جا تا ہے۔ یہ عظیم خسارہ ہے۔ یہ سب سے بڑی تبا ہی ہے۔اقبال مسلمانوں کو کہتا ہے کہ:

ع بے خبر تو جو ہر آئینہ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا اخری پیغام ہے۔

وہ کہتا ہے کہ مسلمان اپنے آپکو، اپنے تن من کو نفس امارہ کی پیروی کرنے میں فقط چند دنیاوی اشیاء کے حصول میں نہ کھپائے۔ اگر وہ اپنے رب کا نا شکرا ہے تو پھر اللہ تو بے نیاز ہے۔ پھر خسارے میں تو انسان ہی رہے گا۔

لہذا اقبال نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کو اس خسارہ عظیم اور نفسانی آوارگی سے واپس روحانی زندگی میں لانے کا واحد نسخہء کیمیا ' فلسفہ خودی' میں ہے۔ جب فلسفہء خودی سے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف مراجعت کا سفر اختیار کر لیں گے تو دین و دنیا دو نوں میں فلاح پا لیں گے۔ انکے خیال میں مسمانوں کی پسماندگی، غلامی، جہالت اور دنیا پرستی کا علاج '' فلسفہء خودی ''میں پنہاں ہے۔

اقبال کہتا ہے:

ع دیار عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئی صبح و شام پیدا کر
میرا طریق امیری نہیں، فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

خودی کے خواص:

اقبال کے شاہین کے جو صفات ہیں، وہی فلسفہء خودی کے خواص ہیں

بلند پرواز، تیز نگاہ، کسی اور کا مارا ہوا شکار نہ کھانا، خلوت پسندی۔ جب انسان نفیس ترین خودی کی منزل کی طرف اپنا سفر شروع کرتا ہے تو وہ ان صفات کا حامل ہوتا ہے۔ وہ فقر و عشق سے بھی معمور ہوتا ہے۔ تب وہ اپنی منزل کے اختتام پر مرد مومن اور مرد حق بن جاتا ہے۔ تب وہ خودی کے دیگر مدارج بھی طے کر کے للہ کا صحیح کارکن اور قبول بندہ بن جاتا ہے۔

خودی کے میٹھے پھل کا حصول: عشق وہ سر زمین ہے جس پر خودی کے میٹھے پھل کا درخت اُگتا ہے۔

عشق کے بغیر کوئی انسان نفس امارہ سے بلند ہو کر نفس راضیہ کے مدارج طے نہیں کر سکتا۔ سچی بات یہ ہے کہ انسان نفس امارہ کے دلدل سے خا کی وجود کو نکال کر 'خو دی محمود ' کی طرف کا روح پرورسفر، عشق کے بغیر نہیں کر سکتا۔

خودی کے مدارج :

نفس امارہ۔ نفس لوامہ۔ نفس ملحمہ۔ نفس مطمئنہ۔ نفس مرضیہ۔ نفس راضیہ۔

نفس امارہ: اسکا مطلب ہے ، دنیا پرستی، مادہ پرستی اور شیطان پرستی۔ تکبر، غرور اور انکار حتیٰ کہ انسان کفر کے مقام پر پہنچ جاتا ہے۔

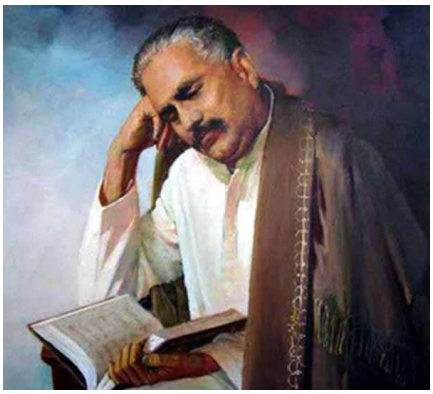

نفس لوامہ: انسان جب مادہ پرستی ترک کرتا ہے اور رب کی رضا کی طرف سفر شروع کرتا ہے۔ اپنے رب کی رضا کے لئے عبادات اور ریاضت شروع کرتا ہے۔ یہ کامیابی کا راستہ ہے۔ یہ وہ مقام ہے جب ایک مسلمان کو اپنی اصلیت کا احساس ہو جا تا ہے کہ اللہ نے اسے خاکی وجود کے ساتھ ساتھ اسکے اندر ایک نفیس روح بھی عطاء فرمائی ہے۔ اس روح کی پہچان اور اسکے تقاضے پورے کرنا لازم ہے۔ رب نے اسے اپنی بندگی کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور یہ کہ مادہ پرستی اور خدا کی مرضی کے خلاف دنیا پرستی خسا رے کا سودا ہے۔

نفس ملحمہ: خودی اور خود آگاہی کے راستے پر سفر کرتے کرتے انسان اس مقام پر آجاتا ہے جب رب کی طرف سے نیک اور پاکیزہ خیالات آنے لگتے ہیں۔ اللہ تعا لیٰ کی طرف سے رہنمائی ملتی ہے۔

نفس مطمئنہ: اس مقام پر انسان خدا کا مخاطب ہو جاتا ہے۔ وہ خدا کے قریب اور شیطان سے کافی دور چلا جاتا ہے۔ انسان کو اطمنانِ قلب نصیب ہو جاتا ہے۔ دنیاوی آسائشیں اور دلکشیاں بے معنی ہو جاتی ہیں۔ وہ ہر حال میں اپنے رب کی رضا پر خوش رہتا ہے۔ کوئی شکوہ شکایت نہیں رہتی۔

نفس راضیہ: بندگی اور خودی کا سفر جب مز ید آگے بڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ انسان سے راضی ہوجاتا ہے۔بندہ اپنی بندگی کے اس مقام پر اپنے رب کو راضی کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ ایک مسلمان اپنی عبادات اور ریا ضتوں سے اپنے محبوب رب کو خوش کر دیتا ہے۔ تب اللہ اپنے بندے فرماتا ہے کہ تو میرا سچا بندہ ہے۔ میں تیری بندگی سے راضی ہوا۔ اقبال کہتا ہے:

ع ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی بُرہان
نہ تاج و تخت میں ہے نہ لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مر دِ قلندر کی نگاہ میں ہے

نفس مرضیہ: خودی اور کامل بندگی کی بلندی کا یہ آخری مقام ہے خدا تعالیٰ سب سے بڑا قدردان ہے۔ یہ وہ مقام ہے جب اللہ پاک اپنے بندے سے اتنا خوش ہو جائے کہ اپنے بندے کی مرضی کے مطابق فیصلے کرنے لگے۔ جب انسان مقتدر بن جائے۔ اس مقام پر انسان اپنے تقدیر خود لکھوانے لگتا ہے۔ اللہ اسکی ہر مراد پوری کرتا ہے۔ ہر سفارش قبول کرتا ہے۔ اللہ رعا لیٰ اپنی خلائق اسکے تابع کر دیتا ہے۔ خودی کے اس آخری درجے پر بندہ اپنے خالق کی اس قدردا نی کا حقداربن جاتا ہے۔

علامہ اقبال نے اس مقام کی صحیح عکاسی کے لئے ہی وہ مشہور شعر کہا ہے:

خو دی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پو چھے بتا تیری رضا کیا ہے

اور

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اسکی زورِ بازُو کا
نگاہِ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

حضرت علامہ اقبال کا ''فلسفہ خودی ''انکی شاعری کا نچوڑ ہے۔یہ وہی فلسفہ ہے جسے برصغیر کے کمزور اورغلام مسمانوں نے اپنا کر اپنے لئے ایک الگ آذاد وطن پاکستان حاصل کیا۔اس فلسفے پر عمل پیرا ہو کر ہم آج بھی اپنی دنیاوی زندگی کا رخ موڑ سکتے ہیں تا کہ فا نی انسان جو کہ اپنی اصلیت، اپنی روح کی تقاضوں کو بھول چکا ہے وہ ایک اللہ کی مرضی کے مطابق اپنی روح کی پرورش شروع کرسکے۔

قرآن مجید کی سورۃ حشر میں اللہ نے جس نوع کے انسانوں کو نا پسند فرمایا ہے ، ہمیں چاہئے کہ ہم ایسے ا نسانوں کا راستہ چھوڑ دیں جنھوں نے رب کو بُھلا دیا ہے۔ وہ خسارے اور مکمل تباہی کا راستہ ہے ۔ اقبال ہمیں تعلیم دیتا ہے کہ فانی وجود کو اتنا وقت دو جتنا انسانی بدن نے ا س دنیا میں رہنا ہے اور اپنی ۔'' روح'' کی پاکیزگی کو اِتنا وقت دیں جتنا اس نے وہاں اُس جہاں میں اپنے خالق کے پاس رہنا ہے۔

اقبال کا '' فلسفہء خودی'' اپنانے میں انسانیت کی فلاح ہے۔ اس میں شیطان کی غلامی سے نجا ت ہے۔ سچ یہ ہے کہ مادہ پرستی اور نفس آ مارہ کا راستہ چھوڑ کر اقبال کے فلسفہء خود ی کو اپنا کر اور سورۃ حشر کے مطابق ہم اپنے رب کی رضا کا راستہ اختیار کر سکتے ہیں۔

' اسرارِ خودی ' میں اقبال کہتا ہے:

اے مسلمان! تُو خودی کو نہ چھوڑ اور خود کو اس طرح بنالے، جسکا انجام بقاء پر ہو۔

تیری چمک دمک خودی کی نور سے ہے ۔ اگر تُو اپنی خودی کو مضبوط کر لے، تُو تجھے دوام حاصل ہو جائے۔

§§§

# بہتر گھر

مصنف: یوسف

ایک شخص نے بہتر گھر خریدنے کیلئے اپنا پہلے والا گھر بیچنا چاہا۔
اس مقصد کیلئے وہ اپنے ایک ایسے دوست کے پاس گیا جو جائیداد کی خرید و فروخت میں اچھی شہرت رکھتا تھا۔
اس شخص نے اپنے دوست کو مدعا سنانے کے بعد کہا کہ وہ اس کے لئے گھر برائے فروخت کا ایک اشتہار لکھ دے۔
اس کا دوست اِس گھر کو بہت ہی اچھی طرح سے جانتا تھا۔ اشتہار کی تحریر میں اُس نے گھر کے محل وقوع، رقبے، ڈیزائن، تعمیراتی مواد، باغیچے، سوئمنگ پول سمیت ہر خوبی کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا۔
اعلان مکمل ہونے پر اُس نے اپنے دوست کو یہ اشتہار پڑھ کر سُنایا تاکہ تحریر پر اُسکی رائے لے سکے۔
... اشتہار کی تحریر سُن کر اُس شخص نے کہا، برائے مہربانی اس اشتہار کو ذرا دوبارہ پڑھنا۔ اور اُس کے دوست نے اشتہار دوبارہ پڑھ کر سُنا دیا۔
اشتہار کی تحریر کو دوبارہ سُن کو یہ شخص تقریباً چیخ ہی پڑا کہ کیا میں ایسے شاندار گھر میں رہتا ہوں؟
اور میں ساری زندگی ایک ایسے گھر کے خواب دیکھتا رہا جس میں کچھ ایسی ہی خوبیاں ہوں۔ مگر یہ کبھی خیال ہی نہیں آیا کہ میں تو رہ ہی ایسے گھر میں رہا ہوں جس کی ایسی خوبیاں تم بیان کر رہے ہو۔ مہربانی کر کے اس اشتہار کو ضائع کر دو، میرا گھر بکاؤ ہی نہیں ہے۔
ایک بہت پرانی کہاوت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ نعمتیں تمہیں دی ہیں ان کو ایک کاغذ پر لکھنا شروع کر دو، یقیناً اس لکھائی کے بعد تمہاری زندگی اور زیادہ خوش و خرم ہو جائے گی۔
اصل میں ہم اللہ تعالیٰ کا شکر کرنا ہی بھلائے بیٹھے ہیں کیوں کہ جو کچھ برکتیں اور نعمتیں ہم پر برس رہی ہیں ہم اُن کو گننا ہی نہیں چاہتے۔

ہم تو صرف اپنی گنی چنی چند پریشانیاں یا کمی اور کوتاہیاں دیکھتے ہیں اور برکتوں اور نعمتوں کو بھول جاتے ہیں۔
کسی نے کہا: ہم شکوہ کرتے ہیں کہ اللہ نے پھولوں کے نیچے کانٹے لگا دیئے ہیں۔ ہونا یوں چاہیئے تھا کہ ہم اللہ کا شکر ادا کرتے کہ اُس نے کانٹوں کے اوپر بھی پھول اگا دیئے ہیں۔
ایک اور نے کہا: میں اپنے ننگے پیروں کو دیکھ کر کُڑھتا رہا، پھر ایک ایسے شخص کو دیکھا جس کے پاؤں ہی نہیں تھے تو شکر کے ساتھ اللہ کے سامنے سجدے میں گر گیا۔
اب آپ سے سوال
کتنے ایسے لوگ ہیں جو آپ جیسا گھر، گاڑی، ٹیلیفون، تعلیمی سند، نوکری وغیرہ، وغیرہ، وغیرہ کی خواہش کرتے ہیں؟
کتنے ایسے لوگ ہیں جب آپ اپنی گاڑی پر سوار جا رہے ہوتے ہو تو وہ سڑک پر ننگے پاؤں یا پیدل جا رہے ہوتے ہیں؟
کتنے ایسے لوگ ہیں جن کے سر پر چھت نہیں ہوتی جب آپ اپنے گھر میں محفوظ آرام سے سو رہے ہوتے ہیں؟
کتنے ایسے لوگ ہیں جو علم حاصل کرنا چاہتے تھے اور نا کر سکے اور تمہارے پاس تعلیم کی سند موجود ہے؟
کتنے بے روزگار شخص ہیں جو فاقہ کشی کرتے ہیں اور آپ کے پاس ملازمت اور منصب موجود ہے؟
اور وغیرہ وغیرہ وغیرہ ہزاروں باتیں لکھی اور کہی جا سکتی ہیں۔۔۔۔
کیا خیال ہے ابھی بھی اللہ کی نعمتوں کے اعتراف اور اُنکا شکر ادا کرنے کا وقت نہیں آیا کہ ہم کہہ دیں
یا رب لک الحمد کما ینبغي لجلال وجہک وعظیم سلطانک
اللہم لک الحمد حتی ترضی و لک الحمد إذا رضیت ولک الحمد بعد الرضا

§§§

# چینی کے بغیر چینی چائے کا لطف

مصنف: یوسف

چینی ثقافت میں چائے کو ایک خاص اہمیت حاصل ہےاگرچہ پاکستان میں پی جانے والی چائے سے چینی چائے قدرے مختلف ہے لیکن چائے سے منسلک کچھ روایات ، چائے سے جڑے کچھ لوازمات اور لوگوں کی پسندیدگی کے مختلف معیارات چینی چائے کو ایک خاص رنگ دیتے ہیں۔ چینی معاشرے میں اگر چائے کی تاریخ کا جائزہ لیں تو ہمیں پانچ ہزار سال پیچھے جانا پڑے گا۔ بتایا جاتا ہے کہ ایک چینی بادشاہ شین نونگ نے اپنے دور حکومت میں جہاں دیگر فرمان جاری کیے ان میں ایک حکم یہ بھی تھا کہ صحت مند اور توانا رہنے کے لیے پینے کے پانی کو استعمال سے قبل ضرور ابالا جائے۔ گرمیوں کی ایک دوپہر اپنی سلطنت کے ایک دور دراز علاقے کے دورے کے دوران بادشاہ اور ان کے درباری ایک مقام پر سستانے کی غرض سے رکے اور بادشاہ سلامت کے لیے پانی ابالا جا رہا تھا کہ اسی دوران نزدیکی جھاڑی سے کچھ پتیاں ابلتے پانی میں آ گری اور پانی کا رنگ فوری تبدیل ہو گیا۔ اب بادشاہ کے دل میں پانی کے اس نئے ذائقے کو چکھنے کی خواہش نے جنم لیا ، جب انہوں نے پتیوں ملا رنگ دار پانی پیا تو ذائقے دار بھی لگا سو یہیں سے چائے کا آغاز ہوتا ہے اور یہ دور تھا 2337 قبل مسیح ۔ اس وقت سے لیکر آج تک چین میں چائے کو مختلف تقاریب میں نمایاں اہمیت حاصل ہے بلکہ یوں کہا جائے کا چائے کا راج ہے تو بے جا نہ ہو گا۔

اگر چینی معاشرے میں چائے کے استعمال کی بات کی جائے تو اس میں بھی آپ کو مختلف رنگ ملیں گے۔ کچھ لوگ چائے کو پیاس بجھانے اور پانی کے نعم البدل کے طور پر استعمال کرتے ہیں تو کچھ کے نزدیک چائے پینے سے ان کی تخلیقی صلاحیتیں کھل کر سامنے آتی ہیں ۔ بعض افراد تو فطری ماحول سے محبت ، موسیقی میں دلچسپی اور باہمی روابط استوار کرنے میں بھی چائے کے معترف نظر آتے ہیں۔ مزید دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ چین میں معیاری چائے کے بھی پیمانے وضع کیے گئے ہیں ایسا ہر گز نہیں کہ جس طرح پاکستان میں اکثر کہا جاتا ہے کہ بس چائے ہونی چاہیے چاہے کسی ٹرک ہوٹل کی ہو یا کسی فائیو اسٹار ہوٹل ، یہ الگ بات ہے کہ پاکستان میں لوگوں کی اکثریت ٹرک ہوٹل کی چائے کو کسی بھی بڑے ہوٹل کی چائے سے بہتر قرار دیتی ہے، پیمانوں کی بات ہو رہی تھی تو چین میں چائے کو جن خصوصیات کی بناء پر پرکھا جاتا ہے اس میں پہلی خاصیت چائے کی رنگت ، دوسری چائے کی خوشبو ، تیسری خاصیت چائے کا زائقہ ہے لیکن جناب بات یہیں ختم نہیں ہوتی مزید دو چیزیں اور بھی شامل ہیں جو پاکستان سمیت دیگر دنیا سے قدرے مختلف ہیں پہلی چیز پانی کا معیار مطلب یہ کہ پانی کون سا استعمال کیا گیا ہے اور آخری چیز چائے سیٹ ،مطلب چائے پیش کرنے کے لیے کس قسم کے برتن استعمال کیے گئے ہیں۔ مختصراً یہی کہ برتن جتنا معیاری اور اچھا ہو گا اتنی ہی چائے کے لیے پسندیدگی بڑھے گی ، ویسے معیاری کو آپ مہنگے برتن سے بھی تعبیر کریں تو کوئی حرج نہیں۔

اب چائے تو پیش کر دی گئی اگلا مرحلہ پینے کا ہے تو جناب چین میں چائے پینے کے بھی کچھ اصول ہیں مثلاً چائے آپ نے گرم گرم ہی ختم کرنی ہے ایسا نہیں کہ ساتھ ساتھ دفتر کا کام بھی جاری ہے اور چائے بے شک ٹھنڈی ہو جائے ، اس حوالے سے کہا جاتا ہے کہ چائے میں موجود مفید اجزاء سے لطف اندوز صرف گرم چائے سے ہی ہوا جا سکتا ہے۔ ایک اصول یہ بھی ہے کہ زیادہ سخت یا اگر پاکستانی لفظ استعمال کریں تو زیادہ کڑک چائے نہیں پینی ہے بقول چینی افراد کے کہ زیادہ کڑک چائے انسانی معدے کے لیے نقصان دہ ہے ۔اس کا معیار یہ طے کیا گیا ہے کہ پورے دن میں آپ بارہ سے پندرہ گرام کے درمیان چائے کی پتیاں استعمال کریں گے۔چائے پینے کے لیے بہترین اوقات کا تعین بھی کیا گیا ہے ایسا نہیں ہے کہ جب جی چاہا چائے پی لی ، چینی افراد کھانے سے کچھ دیر قبل یا فوری بعد چائے نہیں پیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر کھانے سے پہلے چائے پی لی تو بھوک ختم ہو جائے گی اور اگر فوری بعد پی تو بد ہضمی کا شکار ہو سکتے ہیں۔ایک اور اہم بات جس کا چینی افراد بہت خیال رکھتے ہیں کہ چائے کے ساتھ کسی بھی قسم کی ادویات کا استعمال نہیں کریں گے ایسا نہیں کہ پاکستان میں ہم بخار یا سر درد کی گولی بھی اکثر چائے کے ساتھ ہی لیتے ہیں۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے ایک اور بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ دفاتر ، گھر اور ہوٹل میں پی جانے والی چائے میں بھی فرق ہو گا مثلاً دفاتر میں زیادہ گرین ٹی یا سبز چائے استعمال کی جائے گی اس کی وجہ بتائی جاتی ہے کہ سبز چائے میں ایسے اجزاء پائے جاتے ہیں جو کمپیوٹر سے نکلنے والی شعاعوں سے انسانی جسم کو بچانے میں مفید ثابت ہوتے ہیں اور انسانی جسم میں سبز چائے نمی کی مقدار کو برقرار رکھنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

اگر چین میں چائے کی مختلف اقسام کے حوالے سے دیکھیں تو ان کو گرین ٹی ، بلیک ٹی ، ڈارک ٹی ، اولانگ ٹی اور وائٹ ٹی میں تقسیم کیا گیا ہے اور چائے کی ہر قسم کے ساتھ کچھ کہاوتیں یا کچھ روایات منسوب ہیں۔ مثلاً گرین ٹی کو سادگی سے منسوب کیا جاتا ہے اور عام طور پر جنوبی چین میں رہنے والے باشندوں کے حوالے سے کہا جاتا ہے وہ اس کو زیادہ استعمال کرتے ہیں ، بلیک ٹی کو ایسے افراد سے منسوب کیا جاتا ہے جو نرم دل اور شرمیلے ہوتے ہیں ، اولانگ ٹی کو ملنسار اور عام طور پر فلسفیانہ مزاج رکھنے والے افراد کی پسند قرار دیا جاتا ہے اسی طرح ڈارک ٹی کو بزرگ دانا افراد کی پسند میں شمار کیا جاتا ہے۔ایک اور بات نہایت اہم ہے کہ پورے چین میں چینی کے بغیر چائے پینے کا رواج ہے کیونکہ چین کے لوگ چینی کے زیادہ استعمال کو صحت کے لیے انتہائی نقصان دہ قرار دیتے ہیں اور موٹاپے کی بڑی وجہ بھی چینی کے زیادہ استعمال کو قرار دیتے ہیں۔

اگر معاشی اعتبار سے دیکھیں تو چین میں چائے کی صنعت ملک کی معاشی ترقی میں بھی ایک کلیدی کردار ادا کر رہی ہے اور چین کا شمار دنیا کے ان بڑے ممالک میں ہوتا ہے جو دنیا کے دیگر ممالک کو چائے کی برآمد میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ چین کی حکومت بھی اس صنعت کی ترقی کے حوالے سے اقدامات کرتی رہتی ہے اور یہ کوشش کی جاتی ہے جہاں ملکی ضروریات کوپورا کیا جا سکے وہاں بیرونی ممالک میں بھی معیاری چائے برآمد کی جا سکے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر ملک کے مختلف حصوں میں چائے کی صنعت کی ترقی اور ملک میں ٹی کلچر کے فروغ کے لیے بھی مختلف سیمینارز ، کانفرنسز اور دیگرتقاریب کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ سو جب بھی چین آئیں چینی چائے سے ضرور لطف اٹھائیں لیکن وہ بھی بغیر چینی کے۔

§§§

# لاہور ایک قدیم شہر

مصنف: یوسف

تحریک پاکستان کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے۔جتنی خود مسلمانوں کی۔اس لیے کہ پاکستان دو قومی نظریے کی بنیاد پر حاصل کیا گیا۔دو قومی نظریے کی بنیاد ہندوستان میں اس دن پڑ گئی تھی۔ جس دن ساحل مالا بار کی ریاست گدنگا نور کے حکمران راجہ سامری نے اسلام قبول کیا تھا۔رفتہ رفتہ دین اسلام کی شواعیں پھیلتی گئیں۔ محمد بن قاسم نے 712 میں سندھ فتح کر کے اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی۔ اسلامی حکومت کے قیام سے انگریز حکومت تک مختلف مسلمان خاندانوں کی حکمرانی میں برصغیر میں اسلامی حکومت قائم رہی۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس کے نا اہل جانشیوں کے باعث بر طانوی حکومت نے اسلامی حکومت پر قبضہ کر لیا۔ ہندووں نے گٹھ جوڑ کرتے ہوے اسلامی دشمنی کے سبب وسیع پیمانے پر مسلمانوں کا جانی و مالی نقصان کرانے کی بھر پور کوشش کی۔

1938 میں سندھ مسلم لیگ کی اکثریت کے ساتھ آزاد ملک کے حق میں باقاعدہ ایک قرارداد منظور کی اور 23 مارچ 1940 کو مسلم لیگ کے 27 ویں سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور میں ایک اسلامی مملکت کے قیام کا مطالبہ کر دیا۔

لاہور صوبہ پنجاب پاکستان کا دارلحکومت اور پاکستان کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ یہ پاکستان کا ثقافتی، تعلیمی اور تاریخی مرکز ہے۔ اسے پاکستان کا دل بھی کہا جاتا ہے۔ یہ شہر دریاے راوی کے کنارے واقع ہے۔ اس کی آبادی ایک کروڑ کے قریب ہے۔ شاہی قلعہ، شالامار باغ، بادشاہی مسجد، مقبرہ جہانگیراور مقبرہ نور جہاں مغل دور کی یادگار ہیں۔ لاہور کو پہلے عروس البلد لاہور بھی کہتے تھے اور یہ علاقہ ملتان کی عظیم سلطنت کا حصہ ہوتا تھا۔

لاہور کی مغلیہ دور میں بھی اپنی ایک حیثیت رہی ہے۔ بابر پہلے سے ہی ہندوستان پر حملہ کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ دولت خان لودھی کی دعوت نے اس پر مہمیز کا کام کیا۔ لاہور کے قریب بابر اور ابرہیم لودھی کی افواج کا پہلا ٹکراؤ ہوا۔ جس میں بابر فتح یاب ہوا۔ لیکن جب اسے دولت خان کی سازش کی اطلاع ملی۔ جس پر وہ اپنا ارادہ ختم کر کے لاہور کی جانب بڑھا۔

اس شہر میں کئی بزرگوں اور صوفیاے کرام کے مزارات ہیں جن میں حضرت داتا گنج بخش، حضرت میاں میرمادھولال حسین، حضرت شاہ ابوالمعانی، حضرت موج دریا بخاری، حضرت گھوڑے شاہ، حضرت شاہ جمال حضرت شاہ محمد غوث اور حضرت میاں وڈھا شامل ہیں۔ لاہور کا موجودہ شہر کئی جدید بستیوں اور عمارات سے آراستہ ہے۔ ان میں ماڈل ٹاؤن، گلبرگ، ڈیفنس، سبزہ زار گرین ٹاؤن اور ٹاؤن شپ اہم ہیں۔ شہر کے قابل دید مقامات میں ایئر پورٹ، عجائب گھر، پنجاب یونیورسٹی، باغ جناح، شالامار باغ، مینار پاکستان، مال روڈ، انارکلی گلشن اقبال اور ریس کورس پارک شامل ہیں۔

مینار پاکستان کا ڈیزائن ترک ماہر تعمرات نصر الدین مرات خان نے تیار کیا۔تعمیر کا کام میاں عبد الخالق اینڈ کمپنی نے 23 مارچ 1960 میں شروع کیا۔21 اکتوبر 1968 میں اس کی تعمیر مکمل ہوی۔اس پر کل لاگت 75 لاکھ روپے آئے۔

بادشاہی مسجد لاہور میں شاہی قلعے کے نزدیک واقع ہے۔اس مسجد کو مغل بادشاہ شا جہاں نے بنوایا تھا۔ اس میں دو لاکھ کے قریب نمازی نماز ادا کرتے ہیں۔اس کے چاروں کونوں میں بہت اونچے مینار ہیں۔مینار پر چڑھنے کے لیے باقاعدہ ٹکٹ لینا پڑتا ہے۔اس مسجد کے درمیان میں بڑا حوض ہے۔

مسجد میں تین بڑے بڑے سنگ مر مر کے گنبد ہیں۔ ان پر مینا کاری اور گل کاری کی ہوئی ہے۔ جسے دیکھ کر مغلیہ راج کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ مسجد میں داخل ہونے کے لیے پچاس سیڑھیاں چڑھنی پڑتی ہیں۔ یہاں لوگوں کی بڑی تعداد جمعہ اور عیدین ادا کرتے ہیں جبکہ پانچوں نمازوں میں بھی بہت رش دیکھنے میں آتا ہے۔

§§§

# مدر ڈے

مصنف: یوسف

کہیں سے بھی تھکی ہوئی نظر نہیں آتیں وہ۔ ہردم ہرکام کے لیے کمربستہ،ہرلمحہ مسکراتی ہوئی،اکثردکان پرنظرآتی ہیں۔ ایک کاپی ان کے ساتھ سفرمیں رہتی ہے جس پردکاندارسودا سلف دے کرلکھ دیتاہے اورپھرہرماہ پیسے وصول کرلیتا ہے۔ کپڑے مناسب ہی ہوتے ہیں۔ کبھی دہی لینے جارہی ہیں،صبح سویرے چھوٹے بچوں کواسکول چھوڑنے جارہی ہیں،دوپہر میں ان کابستہ اٹھائے آرہی ہیں۔ شام کوبچے جب گلی میں کھیلتے ہیں تووہ ان کی نگرانی کرتی ہیں۔ لڑائی ہوجائے تو بچوں میں صلح کراتی ہیں اورنجانے کیاکیا۔ کبھی ایک بہو کے ساتھ جارہی ہیں کبھی دوسری کی دوالارہی ہیں۔ ہردم تازہ دم۔ میں انہیں اکثر ہی دیکھتا ہوں اورچھٹی والے دن توخاص طورپر۔ اتوارکو صبح سویرے ہرطرف سناٹاہوتاہے بندہ نہ بندے کی ذات لیکن وہ اللہ کی بندی اس دن کیاریوں سے گھاس پھونس الگ کرتی ہیں،خشک پتے سمیٹتی ہیں،پھرپائپ لگاکرچھڑکاؤکرتی ہیں۔

اُس اتوارکوبھی یہی ہوا۔میں چھت پرکھڑاانہیں دیکھ رہا تھااوروہ اپنے کام میں منہمک تھیں۔ مجھے تونہیں لگتاکہ وہ کبھی آرام کرتی ہوں گی۔ کبھی کبھی وہ اکیلی بیٹھی آسمان کوتکتی ہیں۔ بس ایک دفعہ میں نے انہیں اپنی آنکھیں صاف کرتے دیکھا ہے اپنی سفید چادر سے۔ شوہرکا انتقال توبہت پہلے ہوگیا تھا،پانچ بیٹوں کی ماں ہیں وہ،اوروہ سب کے سب باہرمقیم ہیں۔ شایددوبہوئیں ان کے ساتھ رہتی ہیں۔ان کاکوئی بیٹا پاکستان آ رہا ہو تب ان کی خوشی دیدنی ہوتی ہے۔ پورے محلے کو بتاتی پھرتی ہیں:وہ کینیڈاوالاآرہاہے۔ اورپھروہ دن بھی آجاتا ہے جب ان کالختِ جگر پہنچتا ہے کچھ دن تک رہتا ہے تووہ بہت خوش ہوتی ہیں۔ ہاں ایک دن اداس تھیں کہ وہ توآتے ہی اپنے بچوں کوگھمانے پھرانے لگتاہے،میرابچہ توپھر بھی مجھے نہیں ملتا، پھر وہ واپس چلاجاتاہے اورماں کی اداسی اور بھی گہری ہوجاتی ہے۔جن بیٹوں کے بیوی بچے باہرہیں،وہ توکئی کئی سال کے بعداگرآتے ہیں توان کے پاس ایک چھوٹی سی ڈائری ضرورہوتی ہے جس میں پہلے سے لکھا ہوتاہے کہ پاکستان کے فلاں وقت اسے ہرحال میں اپنی بیوی بچوں کوفون ضرورکرناہے، بیوی بچوں کی فرمائشوں کی ایک لمبی فہرست الگ ہوتی ہے جن کی خریداری میں سارادن بھٹکنے کے بعدجب واپس گھرلوٹتاہے توبرسوں کی منتظرماں کے سامنے اپنی تھکاوٹ کااظہارکرکے لیٹنے کی کوئی جگہ ڈھونڈکر بے خبرسوجاتاہے اورماں باربارسوئے بیٹے کودیکھ کرخوش ہوتی رہتی ہے..... .... یہ ہے ان کی زندگی۔

سناہے کہ وہ ایک کالج کی پرنسپل رہ چکی ہیں،ساری عمردرس وتدریس میں گزاردی۔اب بھی کئی غریب بچیوں کی کفالت انتہائی پردہ داری اور خاموشی کے ساتھ سرانجام دیتی ہیں۔ مجھے اس بات کا کبھی پتہ نہ چلتاگربوڑھاڈاکیامجھے اس کی اطلاع نہ دیتا۔ایک دفعہ میں ان کے گھرکے سامنے سے گزر رہا تھاتومجھے روک کرمیرے کل شام کے ٹی وی پروگرام پر تبصرہ فرمانے لگیں۔مجھے جہاں ان کی علمی گفتگونے حیران کردیاوہاں ان کی لاجواب یادداشت نے میرے دل و دماغ کے کئی چراغ روشن کردیئے۔میں جتنی دیرپاکستان میں رہتاہوں ان سے جی بھرکرباتیں کرتاہوں،ان کی ڈھیرساری باتیں سنتاہوں جووہ سارااسال میرے لئے جمع کرکے رکھی ہوتی ہیں۔میں جب ٹیلیفون پران کوسلام کرتاہوں تو ان کی خوش کلامی سے میرادل معطرہوکے رہ جاتاہے لیکن مختصر سی بات کرکے یہ کہہ کرختم کردیتی ہیں کہ تمہیں خواہ مخواہ اس کازیادہ بل آئے گا۔ آؤگے توخوب باتیں کریں گے۔

نہیں آیاتومیں نے پوچھا آج ایسا کون ساخاص دن ہے؟ پاپا! آج مدر ڈے ہے، چھوٹے نے آواز لگائی۔ تب مجھے معلوم ہوا۔ پھراس پربحث ہونے لگی کہ کون سا بچہ اچھاہے۔ کیا نتیجہ نکلامجھے نہیں معلوم.

میں کچھ دیر تک توسوچتارہااورپھرخودبخودمیرے پاؤں ان کے گھرکی سمت چل پڑے۔ وہ مجھے باہرہی مل گئیں۔ کیسی ہیں آپ ماں جی.....بہت شرمیلی ہیں وہ، مسکرائیں اور کہنے لگیں تم کیسے ہو؟ آج صبح سویرے ہی..... جی ماں جی آپ کو سلام کرنے آگیا۔

اور ہاں ایک اور بات..... میں آپ کو"وش"کرنے آیاہوں۔ کس بات کی "وش"؟ انہوں نے پوچھا۔ ماں جی ! آج مدر ڈے ہے ناں۔ جیتے رہو میرے بچے ،سداخوش رہو،خوشیاں دیکھو۔ ان کی آوازکازیروبم میں کیسے تحریرکروں اوران کے آنسو کیسے صفحہ پربکھیروں۔ تھوڑی دیرآسمان کی طرف ٹکٹکی باند ھ کردیکھتی رہیں،بالکل گم سم۔ آپ ٹھیک توہیں ماں جی!میری آوازسن کرچونک سی گئیں اورواپس اسی دنیامیں لوٹ آئیں۔اب توتمہارے سر کے بالوں اور داڑھی میں کافی سپیدی آگئی ہے ،کیاتمہارے پوتے پوتیاں تم سے کہانی سننے کی فرمائش کرتے ہیں؟جی ہاں،کبھی کبھار،وگرنہ آج کل تواسکول کاہوم ورک اوربعدمیں کمپیوٹر پر بچوں کی مصروفیت کے بعددوستوں سے موبائل فون کی گپ شپ اورٹیکسٹ پیغامات نے توگھرمیں عجیب اجنبیت پیدا کررکھی ہے ، بچوں کے پاس اب بڑوں کے پاس بیٹھنے کی فرصت کہاں ؟

تم نے مجھے "مدرڈے" پر"وش" کرکے ماں جی توہان لیااوراس میں کوئی شک بھی نہیں کہ میں تم سے عمر میں کافی بڑی ہوں۔چلوآج ہم دونوں ایک بھولی بسری روائت کوقائم کرتے ہیں۔کہانی سنو گے ؟ انہوں نے اچانک مجھ سے یہ فرمائش کردی۔"ضرور،کیوں نہیں،مدت ہوئی مجھے کوئی کہانی سنے ہوئے"۔انہوں نے ایک کہانی سنائی۔ آپ بھی سنیں:

ایک شخص اپنی ماں کو پھول بھجوانے کا آرڈر دینے کے لیے ایک گل فروش کے پاس پہنچا۔ اس کی ماں دو سو میل کے فاصلے پر رہتی تھی۔ جب وہ اپنی کار سے نیچے اترا تو اس نے دیکھا کہ دکان کے باہر فٹ پاتھ پر ایک نو عمر لڑکی بیٹھی سسکیاں بھر رہی تھی۔ وہ شخص اس لڑکی کے پاس آیا اور اس کے رونے کا سبب پوچھا۔لڑکی بولی: میں اپنی ماں کے لیے سرخ گلاب خریدنا چاہتی ہوں لیکن میرے پاس صرف پچاس پنس ہیں جبکہ گلاب کی قیمت دو پاؤنڈ ہے۔یہ سن کر وہ شخص مسکرایا اور اسے دلاسا دیتے ہوئے بولا ،میرے ساتھ اندر چلو میں تمہیں گلاب دلادیتا ہوں۔ اس نے بچی کو گلاب خرید کر دے دیا اور اپنی ماں کے لیے پھولوں کا آرڈر بک کروایا۔ دکان سے باہر آنے کے بعد اس نے لڑکی کو گھر تک پہنچانے کی پیشکش کی۔ یس پلیز !لڑکی نے جواب دیا آپ مجھے میری والدہ کے پاس لے چلیں۔ لڑکی کی رہنمائی میں وہ ایک قبرستان تک پہنچے۔ لڑکی نے وہ سرخ گلاب ایک تازہ بنی ہوئی قبر پر رکھ کر دعا مانگنے لگی۔ وہ شخص پلٹ کر گل فروش کے پاس پہنچا اس نے اپنا آرڈر منسوخ کرادیا اور ایک گل دستہ لے کرفوری اپنی ماں سے ملنے کے لیے روانہ ہوگیا۔

آخری فقرہ کہتے ہوئے ان کی آوازکپکپانے لگی تومیں نے اپنی جھکی گردن اٹھاکران کے چہرے پرنظرڈالی توانہوں نے منہ پھیرلیاکہ میں ان کی آنکھوں کی چغلی نہ پکڑلوں۔ سنا ہے تم اخبارات میں لکھتے ہو؟لگتاہے جوبچے اپنی ماؤں سے ہزاروں میل دوررہتے ہیں،اب کیاوہ اپنی ماں کی قبر پر سرخ گلاب رکھ کرہی محبت کااظہارکریں گے؟ کتنا مشکل ہے اس طرح جینا.....! "اس سوال کاہے کوئی جواب آپ کے پاس؟

اگرنہیں توپھرجلدی کیجئے کہ ہمارے لئے توہردن"مدرڈے"ہے۔

بنجر کھیت میں جیون کی اک دکھیاری بوڑھی ماں

بویا نہیں، جو کاٹ رہی ہے

§§§

پانچ سال پہلے انہی دنوں میں پاکستان میں تھا۔ آہستہ آہستہ سورج چڑھنے لگا، بجلی نہیں تھی تو گرمی بڑھنے لگی اور پھر سارا محلہ وقت سے پہلے ہی جاگ اٹھا۔ منجھلے بیٹے نے اٹھتے ہی آواز لگائی: "مما آئی لو یو"۔ تب سب سے چھوٹے کی آواز آئی، بھائی میں آپ سے جیت گیا۔ میں نے مما کو سب سے پہلے "وش" کیا۔ تم تو اپنے نمبر بڑھاتے رہتے ہو اور پھر دونوں میں تھوڑی دیر تکرار۔ مجھے سمجھ میں